حرفِ آگہی
مجید کھام گانوی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری
(جامعہ کراچی)

علامہ اقبال کا قول بہت مشہور ہے کہ "فلسفہ آدمی کو بوڑھا بنا دیتا ہے اور شاعری تجدیدِ شباب کرتی ہے۔" یہ قول کسی اور کے حق میں درست ہو یا نہ ہو، مجید کھام گانوی پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔ ان کے فکر و فن میں اضمحلال و واماندگی کے آثار کے بجائے شادابی و تازگی کی بالکل نئی پرچھائیاں نظر آتی ہیں اور قاری کو نئے ڈھب سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق
(شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی)

زخمِ بہاراں کے بعد حرفِ آگہی جناب مجید کھام گانوی کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر زندگی کے گوناگوں تجربات سے گزرنے کے بعد آگہی کی منزل تک پہنچا ہے۔ اس آگہی میں فنی آگہی بھی شامل ہے۔

اردو کی وسعت، ہمہ گیری اور ثقافتی آئینہ داری کی ایک اہم مثال جناب مجید کھام گانوی بھی ہیں کہ ان کی اپنی مادری زبان اردو نہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اردو زبان کی شائستگی اور شیرینی کو اپنے لہجہ میں اس طرح سمو لیا ہے کہ اکثر اہلِ زبان کو رشک آتا ہے۔

مجید کھام گانوی نے بھرپور زندگی گزاری ہے جس کے نقوش ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ اور مجید کھام گانوی کی شاعری کا ایک حوالہ جدوجہدِ آزادی بھی ہے کہ وہ اس کے ایک جیالے سپاہی رہے ہیں۔ اس لئے ان کی غزلوں اور نظموں میں وہ دلکشائی ہے جسے اس دور کی بیداری کی جھلک کہا جا سکتا ہے۔

جناب مجید کھام گانوی نے خاص طور پر غزل کو اپنے فنی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کی غزل میں فنی اہتمام اور جذباتی ہیجان کے ساتھ ساتھ جہاں روایاتِ غزل سے استفادہ کیا گیا ہے وہاں انفرادی تازگی کا بھی احساس ہوتا ہے کہ ان کے بیان کے لہجوں میں خونِ جگر بھی شامل

حرفِ آگہی

تصحیح

صفحہ نمبر ۴ کا مصرعہ ۲ "روشنائی"

〃 ۵۱ 〃 〃 ۹ کا پہلا لفظ "شکست"

〃 ۵۵ 〃 ۱۰ 〃 〃 "رہ"

〃 ۷۲ 〃 〃 ۴ کا قافیہ "آدمی" کے بجائے "زندگی"

〃 ۹۵ 〃 〃 ۱۴ میں لفظ "روز" کا اضافہ

〃 ۹۶ 〃 〃 ۳ کا آخری لفظ "قفس"

〃 ۹۶ 〃 〃 ۴ 〃 〃 "پرواز"

〃 ۱۲۴ 〃 〃 ۱۲ کی ردیف میں "نہ" کا اضافہ

مجید کھام گانوی

سرِ ورق .... ایم۔ انور

نگراں .... وثیق افضل

بہ اہتمام .... بزم فنون پاکستان

اشاعت ۱۹۸۳ء

مطبع .... امیج پرنٹرز کراچی

ناشر .... غلام مصطفیٰ ناز

کتابت .... سید محمد حسن عسکری زیدی نادم ایرایانی۔

" .... حکیم عبدالرحیم خاں۔

قیمت .... ۳۰ تیس روپے

پتہ .... ۲/۲۵۰، شاہ فیصل کالونی

(کراچی نمبر ۲۵)

انتساب

محترم حضرت شاعر لکھنوی

کے نام

جن کی رہنمائی نے مجھے اس منزل تک

پہنچایا

محبت سے نئے بہاروں کی کہانی
لہو کی روشنائی سے لکھی ہے

مآلِ غنچہ و گُل دیکھ کر چمن والے
چمن میں خاک تمنّائے رنگ و بو کرتے

زبان رکھتی ہے پھولوں کی بے زبانی بھی
سکوتِ حرف کو پیرایۂ سخن کہیے

نقد و تبصرہ

جو مصلحتِ وقت کو خاطر میں نہ لائے
وہ حسنِ انا چاہیئے فنکار میں رہنا

مجید — حرفِ آگہی کے حوالے سے

شاعر لکھنوی

اس کرۂ ارض پر بسنے والے کروڑوں نفوس، زندگی کے رموز و اسرار کو سمجھنے، اس کی سمت و رفتار کا سراغ لگانے اور اس کے سیاسی و سماجی رویّوں کا احساس و ادراک کرنے کی کوششوں میں صدیوں سے مصروف ہیں لیکن ان میں بہت قلیل تعداد ایسی ہے جو زندگی کی مختلف النوع جہتوں کے اظہار و ابلاغ کی صلاحیت رکھتی ہے۔

شاعر اس اعتبار سے معاشرے میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ وہ زندگی کے بہت سے داخلی و خارجی عوامل کو لفظوں کے متناسب اور متوازن پیرہن میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ شاعری زندگی کی نزاکتوں، تہوں، پرتوں اور باریکیوں سے لوگوں کو متعارف کرانے کا ایک عمل ہے۔

کسی شاعر کے کلام کو پرکھنے اور اس کے تجزیے کا سب سے بہتر پیمانہ یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعری کے وسیلے سے زندگی کو روشناس کرانے کا فرض کس حد تک ادا کیا ہے اور اس کی کاوشوں سے زندگی کے سیاسی، سماجی، معاشی و معاشرتی اور تہذیبی ڈھانچے کو پرکھنے میں کہاں تک مدد ملتی ہے۔ اگر کسی شاعر کا کلام ان خصوصیات سے خالی ہے تو اس کی شاعری کو، ذہنی ورزش اور لفظی بازی گری سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ اس روشنی میں جب ہم مجید کھام گانوی کی، حرف آگہی، کا بغور جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس کا اندازہ

ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کی دھڑکتی ہوئی نبض پر انگلیاں رکھ کر اس کے داخلی جذبوں کا احساس وادراک کیا ہے ان کو اپنے شعری اظہار کے سانچے میں پوری فنّی چابک دستی کے ساتھ ڈھال کر اہل نظر کے سامنے پیش کیا ہے۔ زندگی اپنے وجود میں بے شمار تہیں اور پرتیں رکھتی ہے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ شاعر نے اپنے مطالعے، مشاہدے اور تجربے کے حوالے سے کن کن تہوں اور پرتوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا ہے اور اس عملِ تخلیق سے اس کی شناخت میں کس حد تک مدد ملتی ہے۔

مجید کھام گانوی کی شاعرانہ کاوشوں کو پرکھنے کے بعد واضح طور پر اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مشاہدہ عمیق، ان کا مطالعہ اور تجربہ وسیع ہے، اپنی زندگی کی ۱۷ سالہ طویل مسافت میں وہ طلسمِ حیات کے پیچ وخم کی سینکڑوں راہوں سے گزرے ہیں جن کی پرچھائیاں ان کے اشعار میں جگہ جگہ چلتی پھرتی اور سانس لیتی نظر آتی ہیں لیکن اس طویل شعری مسافت میں سیاسی و سماجی بصیرت وبصارت کا جو ایک مربوط سلسلہ ملتا ہے وہ ان کی قوتِ اظہار کا ایک امتیازی نشان بن گیا ہے۔ ان کے حالات و واقعات کے بہت سے باب میری نظر کے سامنے ہیں جن سے ان کی نوجوانی اور بزرگی کے درمیان سیاسی و سماجی عمل و ردِّ عمل کی ایک تاریخ مرتّب ہوتی ہے۔ وہ شعور کی آنکھ کھولتے ہی عملاً اُن تحریکات میں شریک رہے ہیں جو سیاست کے میدان میں مسلمانوں کی باہمی تنظیم اور مستقبل کی بہتری کے لیے قائم کی گئیں۔ اس لحاظ سے اگر ہم ان کی شاعری کو سیاسی شعور کے حوالے سے پرکھیں تو یہ عمل حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں اگر ہم یہ کہیں کہ ان کی شاعری سیاست کا دودھ پی پی کر جوان ہوئی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ممکن

ہے اس کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہو کہ سیاست کا یہ شعور انھیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملا ہے۔ ان کی خاندانی تاریخ کے اوراق پر یہ حقیقت ثبت ہے کہ ان کے آباؤ اجداد نے ۱۸۵۷ء کے سیاسی ہنگاموں کے دوران اپنے ملک کی آزادی و سلامتی کے جذبے کو سامراجیت کی وفاداری پر ترجیح دی اور اپنا تعلق تحریکِ آزادی کے علمبرداروں کے ساتھ رکھا جس کے نتیجے میں ان کے بہت سے ساتھی ظلم و تشدد کا نشانہ بنے، خود انھوں نے کتنے ہی ویرانوں اور جنگلوں کی خاک چھانی، گھر سے بے گھر ہوئے اور خاندان کی تباہی کے پیش نظر کھام گاؤں میں آباد ہو گئے، پٹھان ہونے کے باوجود قبیلہ شیخاں سے اپنی نسبت ظاہر کی اور اگر خاندان کے بزرگ اس راز سے پردہ نہ اٹھاتے تو مجید کھام گانوی اور ان کے عزیز و اقربا اصل حقیقت سے بے خبر رہتے۔ کھام گاؤں مہاراشٹر کے صوبے (ہندوستان) میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں کی اکثریت 'مرہٹی زبان' بولتی ہے ان کے بزرگوں نے بھی اسی زبان کو اپنایا اور یہی زبان ان سے ہوتی ہوئی مجید کھام گانوی تک پہنچی۔

انگریزی سامراجیت سے ہندوستان کی رہائی سے قبل مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی تحفظ کی خاطر متعدد تحریکوں نے جنم لیا۔ چونکہ ان تحریکوں کی عوامی مقبولیت 'اردو' میں تحریر و تقریر کے بغیر ممکن نہ تھی اس لئے اردو زبان سے قریبی تعلق نہ رکھنے والوں میں بھی 'اردو' کا ذوق بیدار ہوا۔ یہ ذوق عقیدت کی راہ سے گزر کر رفتہ رفتہ فرض میں تبدیل ہو گیا پھر اس فرض نے خدمت کی شکل اختیار کر لی۔ مجید صاحب اس کارِ خیر میں اپنے بہت سے رفیقوں کے ساتھ شریک تھے۔ اس خدمت

کے صلے میں وہ اُردو کی بارگاہ میں مقبول و محبوب ٹھہرے۔ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت "مسلم لیگ" سے منسلک ہونے کی بناء پر ملک کے چپّے چپّے میں سیاسی جلسوں میں اُردو خطیب کی حیثیت سے شریک ہوتے رہے۔ وہ اپنی تقریروں سے ملّت کے جذبات کو جھنجھوڑتے اور ان میں اپنے مستقبل کی حفاظت کی رُوح پھُونکتے رہے۔ اردو سے محبّت کے جذبے نے شائستہ ہوکر آہستہ آہستہ شعری قالب اختیار کرلیا۔ اس طرح مجید کرکرے "مجید کھام گانوی" کے روپ میں اہل فکر و نظر کے سامنے آئے۔

ان کی شاعری کا سرچشمہ، سیاست کی سوتے سے پھوٹتا تھا گویا سیاسی شعور کی وساطت سے ان کی شعری شعور کا یہ پہلا سفر تھا جو آج بھی اپنی منزل کی طرف ایک سُبک خرام موج کی طرح رَواں دَواں ہے۔

جب کُل ہند مسلم لیگ نے مسلمانوں کی آرزو کو پاکستان کی شکل میں متشکل کیا تو وہ ریاست حیدرآباد ہوتے ہوئے اپنی خدمت کے اسی جذبے کے ساتھ پاکستان کی سرزمین میں داخل ہوئے اور اس طرح اپنے آباواجداد کی تقلید میں ہجرت کا دوسرا مرحلہ طے کیا۔ ان کا سیاسی کردار ہمیشہ جاہ و منصب کے حصول سے بے نیاز رہا اس لئے کردار کی پختگی ان کی شاعری پر بھی پوری طرح محیط نظر آتی ہے اور وہ ایک بے غرض سپاہی کی طرح سیاست اور شاعری دونوں میں اپنا کردار ادا کررہے ہیں۔ انھوں نے اُردو کی جتنی نازبرداری کی، اپنی زندگی کی نہیں کی، یہی سبب ہے کہ اُردو نے انھیں "اہل زبان" کی صف میں جگہ دی اور اسی فیضِ نسبت کی بدولت ان کے پہلے شعری مجموعے "زخم بہار آہ" کو اہلِ فکر و نظر سے سندِ قبولیت عطا ہوئی ان کا دوسرا مجموعہ "حرفِ آگہی" اس اعتبار سے "مئے دو آتشہ" کی

حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں پہلے مجموعے کی منتخب غزلوں کے علاوہ نصف سے زیادہ "افکارِتازہ" بھی شریک ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے وہ سیاسی شعور کی راہ سے شاعری کی منزل میں داخل ہوئے ہیں لیکن سیاست سے ہٹ کر انھوں نے حسن و عشق کے جن موضوعات کو چھوا ہے ان میں بھی اُن کا لہجہ اپنا ایک خاص معیار رکھتا ہے۔ حرفِ آگہی کے مطالعے سے قارئین کرام بہتر طور پر اس کا اندازہ کرسکیں گے کہ ان کی تخلیقات کا رشتہ، زندگی اور اس کی گوناگوں عوامل و اسباب کے ساتھ کتنا ہے۔ اور انھیں زندگی کی گرہوں کو کھولنے اور اس کے گہرے مسائل کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے پر کتنی قدرت حاصل ہے۔

حرفِ آگہی کی تخلیقات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ مجید کھام گانوی نے زندگی کے نہاں خانوں میں اُتر کر، اُس کے رنگا رنگ اور متضاد جذبوں کی کتنی چھان پھٹک کی ہے! زندگی کو پرکھنے، اس کا ادراک کرنے، اس کی طلسمی سُرنگوں کی سیر کرنے اور اس کی بھول بھلیوں سے باسلامت گزرنے میں عمرِ عزیز کا کتنا حصّہ صرف کیا ہے اس کی ادا و اَنا کو سمجھنے اور پرکھنے کا انھیں کتنا تجربہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان کی غزل کی بنیادی حیثیت تک ہماری نگاہ ان کے سیاسی شعور کے حوالے ہی سے پہنچتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے زندگی کے دوسرے اہم شعبوں کا مطالعہ و مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ ان کے کلام سے زندگی کے اُن گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے جو سیاست سے ہٹ کر وقت کے دوسرے اہم مسائل پر محیط ہیں۔ ان کی شاعری کی خصوصیت ان کا شعری وفنی ادراک ہے، یہ ادراک ان کے لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ ذیل کے اشعار مختلف رنگ و رُوپ میں ہمارے اس دعوے پر دلالت کرتے ہیں۔

بن کے خوشبو تمہاری گلیوں میں
میری رُسوائیاں مہکتی ہیں

دل کہاں دل کی جگہ اس کی نظر باقی ہے
آئینہ ٹوٹ گیا، آئینہ گر باقی ہے

عجب ہے سوزِ تعلق کی انجمن کا مزاج
یہاں تو شمع سے پہلے جلے ہیں پروانے

سَو بار نگاہوں سے گزر جائے وہ چہرہ
آنکھوں کو مگر حسرتِ دیدار ہیں رہنا

غنچہ و گُل پہ کوئی تازہ قیامت ٹوٹے
لوگ اتنا بھی نہ ذکرِ لب و رُخسار کریں

آپ دیکھیں تو کبھی راہزنوں کی تاریخ
اس میں کچھ راہ نماؤں کے بھی نام آتے ہیں

کیسے سمجھ میں آئیں گے چہرے حروف کے
بینائی سو گئی ہے کتابوں کے درمیاں

جو مصلحتِ وقت کو خاطر میں نہ لائے
وہ حسنِ اَنا چاہیئے فنکار میں رہنا

بچھڑ کے شاخ سے پھولوں پہ کیا گزرتی ہے
یہ سوچ سوچ کے پہروں ہم آبدیدہ رہے

کیا خبر بوالہوسوں کو کہ تری دید کے بعد
کتنے آئینے مرے دیدۂ حیراں میں رہے

جہاں تک چل رہا ہے دورِ ساغر
وہیں تک میکدے میں روشنی ہے

دل ہے بیکار محبّت کے بغیر
نہیں سایہ تو شجر کیا ہوگا

اب سیم و زر سے ناپتے ہیں قامتِ نسب
تہذیبِ عصرِ نو کا یہ معیار دیکھنا

ہنر تو دیکھ دستِ چارہ گر کا
ابھی تک فصل زخموں کی ہری ہے

مری نظر میں تو مقتل ہیں ایسے میخانے
کہ آدمی نہ جہاں آدمی کو پہچانے

لوگ جب قوّتِ اظہار سے محروم ہوئے
خامشی سے بھی نمایاں کئی مفہوم ہوئے

میں بے زبانئ گُل و غنچہ کو دیکھ کر
پہچاننے لگا ہوں چمن کی ہوا کا رنگ

میں زخم زخم ہوا اس کا غم نہیں مجھ کو
بہت سے لوگ مگر بے نقاب ہو تو گئے

نہ جانے بھول کے رستہ کدھر نکل جائے
چراغ لاؤ کوئی میرِ کارواں کے لئے

اک جنبشِ نگاہ میں تھا فیصلہ مرا
یہ کیا کہ مجھ کو دیکھ کے تلوار دیکھنا

اُداس پھُول، کلی زرد، مضمحل غنچے
کوئی نہیں جو گلستاں کی نبض پہچانے

اب تو حالات کے اس موڑ پہ ہے چارہ گری
زخم دینا بھی جہاں، کارِ مسیحائی ہے

راہبر ساتھ ہیں ایک ایک قدم پر لیکن
یہ تو بتلائے کوئی کتنا سفر باقی ہے

آپ بھی شہرِ چراغاں سے گزر کر دیکھیں
کتنے گھر ہیں جو اندھیروں کا پتا دیتے ہیں

محبت نے بہاروں کی کہانی
لہو کی روشنائی سے لکھی ہے

یہ اور اسی قبیل کے بہت سے اشعار پڑھنے کے بعد آپ کو اندازہ ہو گا کہ مجید کھام گانوی نے زندگی کی کتنی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔

"حرف آگہی" اپنے نام کی معنویت کے اعتبار سے جتنا اہم ہے کلام سے اس کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے۔

مجید صاحب عمر میں بھی مجھ سے بڑے ہیں اور اخلاص میں بھی اور جب کبھی میں نے ان کے اخلاص کی بلندی کو اپنے خلوص سے ناپنے کی کوشش کی ہے تو مجھے اپنی کم قامتی کا شدت سے احساس ہوا ہے۔

"حرفِ آگہی" سے جہاں ایک طرف مجید کھام گانوی کے شعری وفنی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے وہاں میرے ان کے تعلق خاطر پر بھی روشنی پڑتی ہے، ایسا تعلقِ خاطر جس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

مجید کھام گانوی کی شاعری کا ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف ارتقائی سفر ادب و شعر سے ان کی سچی نسبت کا اظہار کرتا ہے اور 'حرف آگہی' کے دروازے پر خوش آئند مستقبل کی وہ دستک صاف طور پر سنائی دے رہی ہے جو کسی شاعر کے مستند و معتبر ہونے کی شناخت ہوتی ہے۔

مجید کھام گانوی نے نہ زمانے کو اپنے سے آگے نکلنے دیا ہے نہ خود اس سے آگے نکلنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا عہد آج بھی ان کی رفتار کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور یہی بنیادی خوبی انھیں اپنے دور کے بہت سے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

ستار علی لکھنوی

۵ فروری ۱۹۸۳ء

مجید کھام گانوی اور ان کا فنی شعور

پروفیسر منظور حسین شور

ہندوستان کی تاریخ میں اردو شاعری قطب قلی شاہ سے لے کر جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر اقبال کے عہد تک کئی ادوار سے گذری ہے۔ ان مختلف ادوار میں شاعری کا مزاج ہر دور میں اپنے تاریخی پس منظر کے ساتھ بدلتا رہا۔ لیکن اگر دور بہ دور کے اس تغیر پر غور کیا جائے تو تاریخ کے اس مسلسل عمل میں آپ کو اردو شاعری کے دو رنگ نفسیاتی طور پر نمایاں نظر آئیں گے۔ ان میں ایک شاعری کے مزاج کا خالص انفعالی رنگ ہے ؂

بہت کیجئے کچھ تو مر رہیئے میرؔ
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اُجڑا کیا، ہم ناتواں دیکھا کئے

جذبات کی یہ انفعالیت اور منفی اندازِ فکر کسی قوم میں خاص طور پر اس دور میں عام ہوتے ہیں جب کوئی قوم شکست خوردہ زوال آمادہ، اور انحطاط پذیر ہوتی ہے لیکن یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ اُس تصویر کا دوسرا رخ وہ ہے جس کو شاعری کے مزاج کا فعالی رنگ کہا جاتا ہے۔ اس رنگ میں شاعری کا اندازِ فکر منفی نہیں ہوتا بلکہ مثبت ہوتا ہے اور جذبے کی انفعالیت

فعالیت سے بدل جاتی ہے:

یہاں کوتاہی ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیّاد ہوتا ہے

مانا کہ آشیاں تو بہت دور ہے مگر
اپنی طرف سے طاقتِ پرواز چاہیئے

اس اندازِ فکر کے شاعر زندگی کے ناسازگار حالات سے محض انفعالی انداز میں اثر ہی قبول نہیں کرتے بلکہ اپنی فکر فعّال سے اپنے ماحول پر خود اثر انداز ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں ایسے لوگ زندگی کے محاذ پر نامساعد حالات کے آگے اپنی شکست کا اعتراف کر کے کبھی سپر نہیں ڈال دیتے بلکہ اس کے محاذ پر نبرد آزما رہنے ہی کو حیاتِ بشری کا ابدی فلسفہ سمجھتے ہیں، اجتماعی سطح پر اقبال کے نزدیک قوموں کے اسی مثبت اور فعّالی اندازِ فکر سے قوموں کی تقدیریں بنتی ہیں ؎

آ! تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

اگر تقسیم ہند سے لے کر اب تک اپنی قوم کے فنکاروں کے فنّی شعور کا جائزہ لیں تو آپ کو تین قسم کے فنکار نظر آئیں گے۔ایک وہ جو اپنی شاعری کی ہیئت اور فن کے مافیہ دونوں اعتبار سے کلاسیکی مزاج کے شاعر ہیں۔ دوسرے وہ جو شعر و ادب کی تمام پُرانی اقدار سے انحراف ہی کو فن کی تخلیق اور پیش رفت کا اصل الاصول قرار دے کر شاعری کی جدّت کے مدّعی ہیں۔ تیسرے وہ جو اندھا دھند روایت شکنی کو عقل کا فالج اور حواس کا اختلال سمجھ کر ماضی کی ہر صحت مند اور تعمیری روایت کی بقاء کو شعر و ادب کی صحت،

بقا، اور پائندگی کے لئے لازمی سمجھ کر ایک بہتر حال اور ایک روشن تر مستقبل کے مطمح نظر کو اپنی شاعری کا "عظیم آئیڈیل" بنا کر ایک مثبت مقصدیت کے تحت شاعری کا چراغ، ہر اس آندھی کی زد پر جلا رہے ہیں جس کا نام سیاسی مصلحت کوشی، سستی شہرت، ادبی اجارہ داری، سماجی استحصال صوبائی تعصّب اور خود غرض گروہ بندی ہے۔ مجید کھام گانوی اس ضمن میں تیسری قسم کے مقصدی شاعروں کے ذیل میں آتے ہیں۔ میں نے ان کے پہلے شعری مجموعے، "زخمِ بہاراں" کے مقدمے میں مختصراً لکھا تھا کہ مجید ایک سپاہیانہ مزاج کے آدمی ہیں۔ ان کی زندگی ابتدا ہی سے قومی محاذ پر ہندوستان کی مخالف طاقتوں سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے گذری ہے، وہ مسلم لیگ کے ایک سرگرم ترین رکن کی حیثیت سے جن محاذوں پر کانگریس سے ٹکراتے رہے، ان میں سیاسی، سماجی، مذہبی اور لسانی سارے محاذ شامل ہیں، ان کو بجا طور پر پاکستان کے محاذ کا ایک عظیم مجاہد کہا جا سکتا ہے لیکن ؎

بہلا نہ دل، نہ تیرگیِ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

یہ تو شوکت علی فانی کا المیہ تھا، مجید کا المیہ یہ ہے کہ وہ جس آگ اور خون کے ناپیدا کنار سمندر کو پیر کے خشکی پر آئے، وہ خشکی آجکل کی نثری نظم کی طرح ایک ہی وقت میں 'خشکی' بھی ہے اور سمندر بھی۔ معلوم نہیں جگر صاحب نے یہ شعر کس عالم میں کہا تھا ؎

آج کچھ اپنا پتہ ملتا نہیں
میں کہاں ہوں اور نگاہِ باریاب

تقسیم ہند کے بعد مجید کی یہ آواز کہ

گھروں کو چھوڑ کے چل تو دیئے ہیں اہلِ سفر
مگر خبر یہ کسی کو نہیں کہاں کے لئے

اگرچہ صرف ایک فرد کی شخصی آواز معلوم ہوتی ہے مگر یہ ایک فرد کی آواز نہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخ کے ایک انقلاب کی آواز ہے جس کے پس منظر میں لاکھوں سہاگنوں کا کہرام، کروڑوں ماؤں کا ماتم اور ان گنت معصوم بچوں کی سسکیاں، انسانیت کی اس دیوار سے اب بھی ٹکرا رہی ہیں، جس کا استحکام قومیت کے شگافوں سے شرمندہ ہے۔ مجید کھام گانوی کی شاعری میں برّصغیر کی شکست وریخت کے خونی حوادث، علامات، استعارات اور کنایات کی صورت میں اپنے دَور کے ترجمان نظر آتے ہیں۔ میں ہر اس شخص کو جو محض لفظی اور قالی طور پر "خون" "زنداں" اور "صلیب و دار" کے الفاظ سے اپنے شعروں کو سجا لینے کا ڈھنگ جانتا ہے "شاعر" کم اور "فنکار" زیادہ جانتا ہوں۔ مجید کھام گانوی کی پوری زندگی قومی محاذ پر لڑتے ہوئے گزری ہے، اس لئے مجید کے سینے کے جتنے زخم ہیں، ان میں رستے ہوئے زخموں کی آوازِ بازگشت مجید کے فن کا نغمہ بھی ہے اور نوحہ بھی ہے۔

9825

چمن چمن گل و لالہ کی سُرخیاں اُبھریں
مرے لہو سے نہ خالی رہی بہار کبھی
ابھی ہے طوق و سلاسل کا مرحلہ درپیش
بنیں گے دار و رسن بھی گلے کا ہار کبھی
آپ بھی شہرِ چراغاں سے گذر کر دیکھیں
کتنے گھر ہیں جو اندھیروں کا پتا دیتے ہیں

میرے چہرے ہی سے ہو سکتا ہے اندازۂ دل
گھر کی حالت در و دیوار بتا دیتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ ادب اور زندگی کے اٹوٹ رشتے میں ادب، زندگی سے نہ صرف یہ کہ کبھی کنارہ کش نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا ہر عمل، ادب کا ردِ عمل بن جاتا ہے۔ اس بنا پر ادب اور زندگی کی دوئی ہر اس فنکار کے فن کی اکائی بن جاتی ہے جس کے فن میں ماحول اور گرد و پیش کے حالات سے بالقصد آنکھ چرا کر محض عوامی مقبولیت کی خاطر فن کے پردے میں مصلحت کوش، جھوٹ نہ بولی جائے۔ مجیدؔ کھام گانوی کے فن میں بے روح قسم کی مضمون بندی اور بصیرت سوز قسم کے اس پندار کو کوئی دخل نہیں جو بر خود غلط انسانوں کے جہل مرکب کی چغلی کھاتا ہے۔ مجیدؔ کھام گانوی کی یہی خود شناسی اور داخلی دیانت ہے جو ان کے فن کا ضمیر ہے اور فن کا یہی ضمیر مجیدؔ کو ایک کھرے، بے باک اور جرأت مند فنکار کی حیثیت سے منفرد کرتا ہے۔ وہ 'خیال'، 'اظہار' اور 'عمل' تینوں صورتوں میں سچ اور سچائی کو اپنے فن کا سب سے بڑا اصول سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی سے فرار یا شکست، سماج کے خلاف سب سے بڑا پاپ ہے ؎

بیداریاں نہ ڈھونڈیئے خوابوں کے درمیاں
دریا کہاں ملیں گے سرابوں کے درمیاں
کیسے سمجھ میں آئیں گے چہرے حروف کے
بینائی سو گئی ہے کتابوں کے درمیاں

مجیدؔ بالطبع غزل کے شاعر ہیں مگر وہ نظم بھی نہایت کامیابی کے ساتھ کہتے ہیں۔ اور اصنافِ سخن میں انھوں نے حمد، نعت، منقبت وغیرہ پر

جہاں طبع آزمائی کی ہے وہاں فکر و نظر کا توازن، احساس کی دیانت اور زبان و بیان کا رچاؤ ہر جگہ نمایاں ہے۔ جہاں تک مجیدؔ کی غزل گوئی کا تعلق ہے یہ ایک ناقابلِ انکار سچائی ہے کہ مجیدؔ ایک نہایت چابکدست اور کامیاب سخنور ہیں۔ ان کی غزل میں خاصی نشتریت ہوتی ہے۔ مجیدؔ کے فن میں جہاں ایک طرف حسن و عشق کی تحلیل نفسی ان کے پڑھنے والے پر ع 'میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'، تغزل کا ایک کیف طاری کر دیتی ہے، وہاں ان کی حقیقت نگاری ان کے پڑھنے والے کے اندر مسائلِ حیات کا وہ شعور بھی بیدار کر دیتی ہے جو ہر مہذب سماج کی تہذیب اور تعمیر کے لئے ضروری ہے۔ نمونتہً ان کے فن کے موضوعی اور معروضی دونوں رخ ملاحظہ ہوں ؎

آدمی جب سے زمیں پر بس گیا
کتنا سناٹا، سرِ افلاک ہے
قامتِ دنیا پہ جب دیکھو مجیدؔ
اِک نئے انداز کی پوشاک ہے

کیا دھوپ میں، کیا سایۂ دیوار میں رہنا
رہنا ہی جو ٹھہرا، نگہِ یار میں رہنا
گھر چھوڑ کے بھی گھر ہی کے آزار میں رہنا
کھوئے ہوئے فکرِ در و دیوار میں رہنا
کچھ اور بڑھا دیتا ہے معنیٰ کا تاثر
چپ رہ کے بھی پیرایۂ اظہار میں رہنا

جو مصلحتِ وقت کو خاطر میں نہ لائے
وہ حسنِ انا چاہیئے فنکار میں رہنا
رندوں کو نہ کردے کہیں میخانے سے بیزار
گردش کا فقط، ایک ہی رفتار میں رہنا

کوئی تڑپ، کوئی ہلچل نہ کوئی ہنگامہ
سکوں بھی ایک قیامت ہے آدمی کے لئے

اب تو حالات کے اس موڑ پہ ہے چارہ گری
زخم دینا بھی جہاں کارِ مسیحائی ہے

ہر لمحہ دے رہا ہے حساب اپنے وقت کا
واعظ کو یہ گماں ہے کہ روزِ جزا ہے اور

مجید کھام گانوی کی شاعری میں روحِ عصر کی بیداری محسوس ہوتی ہے ان کا فن، دل اور دماغ دونوں کو آسودہ کرنے والا فن ہے، وہ اپنی ذات سے سچے ہیں اور اپنے ماحول سے بھی، ان کے یہاں انسانیت، آزادی اور سماج کا جو آورش ملتا ہے اس کی بنا پر ان کا فن، فکر و نظر کا ایک قیمتی سرمایہ ہے جس کو معاشرے اور تہذیب کی ایک حیاتی ضرورت کہنا چاہیئے۔

مجیدبھائی

جیتی جاگتی تاریخ

خورشید احمر

حضرت شاعر لکھنوی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر منظور حسین شور اور ڈاکٹر حنیف فوق کے جامع اور مربوط تبصروں کے بعد مجید بھائی کی شاعری اور ان کی شخصیت کے بارے میں مزید کسی مضمون کی قطعی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن مجید بھائی کی کم و بیش پچاس سالہ طویل سیاسی زندگی کے کئی پہلو قومی اور تاریخی اعتبار سے اس قدر وقیع متنوع اور اہم ہیں کہ اگر کوئی شخص ان پر لکھنے کا بیڑا اُٹھائے تو معاملہ چند صفحات سے نکل کر پوری ایک ضخیم کتاب پر ختم ہوگا جو فی الوقت ہمارے لئے ناممکن ہے۔ اس لئے اس مختصر مضمون پر ہی اکتفا کیا گیا ہے اور یہی مناسب سمجھا گیا کہ مجید بھائی کی سرگرم، بے داغ اور صالح سیاسی زندگی سے براہ راست تعلق رکھنے والے چیدہ چیدہ واقعات و تجربات کو جن سے ان کے شعری جذبوں اور فکری مداولت کی بڑی حد تک تہذیب و تشکیل ہوئی ہے، ضبط تحریر میں لے آیا جائے اور انھیں محفوظ کرلیا جائے تاکہ آئندہ یہ ہمارے لئے اگر ایک طرف تاریخی حوالہ ثابت ہوں تو دوسری طرف مجید بھائی کی شاعری کی تفہیم و تعبیر میں بطور اشاریہ کام آسکیں۔

بلاشبہ مجید بھائی تحریک پاکستان کی ایک جیتی جاگتی تاریخ LIVING HISTORY ہیں۔ ان کی شخصیت کے خدّ و خال پر جدو جہد پاکستان

کی تاریخ ثبت ہے۔ وہ آج بھی نظریۂ پاکستان سے اُتنی ہی والہانہ محبت کرتے ہیں جتنی انھیں شروع میں پاکستان کی تحریک سے تھی۔ اُن کی شاعری کا "روایتی" محبوب بھی پاکستان ہے۔ ان کے احساس کی ہر موج میں پاکستان کی نغمگی رَچی بسی ہے اور اسی نغمگی کو انھوں نے اپنی شاعری کی اساس قرار دیا ہے۔ جو "زخمِ بہاراں" کے بعد اب "حرفِ آگہی" کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

مجید بھائی یکم جنوری ۱۹۱۲ء کو صوبہ برار (موجودہ مہاراشٹر) کے ایک مشہور شہر کھام گاؤں کے ایک مرہٹہ محلہ جونافائل میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی پرائمری اسکول اور ثانوی تعلیم، امراوتی، ناگپور، بمبئی اور کھام گاؤں کے اسکولوں میں حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء میں وہ انجمن ہائی اسکول بمبئی میں میٹرک کے طالب علم تھے۔ یہاں قیام کے دوران مجید بھائی اپنی گوناگوں سماجی اور فلاحی کاموں کے باعث بہت جلد عبدالمجید 'کارکرے' کے نام سے معروف اور مقبول ہوگئے۔ یہاں اُن کو بمبئی کرانیکل CHRONICLE کے چیف ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی کی سرپرستی حاصل رہی۔ تاہم وہ میٹرک کا امتحان نہ بمبئی سے پاس کرسکے اور نہ کھام گاؤں سے۔ اس زمانے میں ملک کے سیاسی حالات کچھ اس نہج پر تھے کہ انھوں نے رسمی تعلیم کو دوبارہ جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے شوقِ مطالعہ پر بھروسہ کرتے ہوئے دوسرے نوجوانوں کی طرح پورے انہماک سے مسلم لیگ کی ملک گیر تحریک میں شامل ہوگئے۔

ان کے والد شیخ عبداللہ اپنے آبائی شہر کھام گاؤں کی مسجد جونافائل کے ایک ممتاز اور محترم خطیب تھے۔ انھوں نے پاکستان منتقل ہونے سے بہت پہلے اپنی رات دن کی محنت اور کوششوں سے جونافائل کے علاقے میں سب

سے پہلے عربی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ اس کارِ خیر میں انھیں عبدالکریم شائق مرحوم کی جو اُس وقت سی پی و برار کے ایک کہنہ مشق اور ممتاز شاعر تھے رفاقت حاصل رہی۔ شیخ صاحب نے انجمن ہائی اسکول کی تعمیر و ترقی میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کے ایک قریبی دوست اور مجید بھائی کے استاد جناب محمد سرفراز خان پرنسپل کی حیثیت سے ۱۹۴۷ء تک اس اسکول سے وابستہ رہے۔ پرنسپل صاحب اپنے تبحرِ علمی اور درس و تدریس میں ماہرانہ درک رکھنے کے سبب اپنے علاقے میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان دنوں کراچی میں مقیم ہیں اور مختلف سماجی اور علمی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔

دوسری گول میز کانفرنس کے انعقاد کے فوراً بعد، جن دنوں مسلم لیگ کے احیاء و تنظیم نو کی ضرورت پورے برصغیر میں شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی اس وقت مجید بھائی کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح وہ بھی اس بات کے آرزومند تھے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی اس سیاسی تنظیم کا احیاء ہو اور اس میں وہ شمولیت اختیار کر سکیں۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں انھوں نے مسلم لیگ کی باقاعدہ رکنیت اختیار کی۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۴ء تک مجید بھائی مختلف رفاہی و سماجی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس ضمن میں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے صرف ۱۳ روپے کی قلیل رقم سے ایک بیڑی فیکٹری کی بنیاد رکھی۔ جس میں دوسرے سال ہی اسّی کے لگ بھگ مسلمان مرد کاریگر کام کرنے لگے اور اتنی ہی تعداد میں ایسی مسلم بیواؤں کو بھی روزگار مہیا کیا گیا جن کو کسبِ معاش کیلئے کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ بیڑی کی یہ فیکٹری "انجمن بیڑی فیکٹری" کے نام سے مشہور تھی۔

کشمیر میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ڈوگرہ شاہی ظلم و استبداد کے خلاف مجلس احرار نے ایک ملک گیر تحریک چلائی تھی۔ اس موقع پر دوسرے صوبوں

کی طرح کھام گاؤں کے مسلمانوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اور اپنے کشمیری بھائیوں کی امداد کے لئے ہزاروں روپے کا عطیہ مجلسِ احرار کو روانہ کیا۔ مجید بھائی نے اس تحریک کو کھام گاؤں کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی اپنی شب و روز کی محنت سے مقبول بنایا۔ اس سلسلے میں جن مسلمانوں نے مجید بھائی سے تعاون کیا ان میں ایک بڑی تعداد موٹر ڈرائیوروں اور موٹر ایجنٹوں کی تھی۔ مولانا شوکت علی کے نام سے ایک اردو لائبریری کا قیام بھی مجید بھائی اور ان کے انہی دوستوں کی مساعی اور کوششوں کا نتیجہ تھا۔ یہ لائبریری آج بھی انجمن مفید الاسلام کھام گاؤں کی سرپرستی میں قائم ہے۔

سن ۱۹۵۰ء میں مجید بھائی اپنے بال بچوں سمیت بمبئی اور حیدرآباد کے راستے پاکستان آ گئے۔ اسلام آباد کی بستی جو اُس وقت حیدرآباد کالونی کراچی کے عقب میں جناح توسیعی شاہراہ پر واقع تھی مجید بھائی وہاں اقامت پذیر ہوئے۔ انھیں یہاں ۱۰۰ مربع فٹ زمین میسّر آ گئی جہاں انھوں نے ایک جھونپڑا ڈال لیا۔ کراچی میں اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کے مقتدر رہنماؤں اور ممتاز کارکنوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو مجید بھائی سے آشنا تھی۔ اس لئے یہاں قیام کے تیسرے دن ہی مجید بھائی کو ایک جلسہء عام میں متفقہ طور پر اسلام آباد مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس جلسے کی صدارت کراچی مسلم لیگ کے صدر اے ایم قریشی نے کی تھی۔

پاکستان میں آمد کے ابتدائی دو سال مجید بھائی کے لئے بڑے صبر آزما تھے۔ کسبِ معاش کا کوئی ذریعہ نہیں تھا لیکن مجید بھائی نے بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔ اسی دوران وہ ایشین میوچل انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور اور ایسٹرن جنرل انشورنس کمپنی لمیٹڈ کراچی سے وابستہ ہو گئے اور ان کے

نشو و نما میں بھر پور کردار ادا کیا۔ یہ دونوں بیمہ کمپنیاں بفضلہٖ تعالیٰ اب بھی موجود ہیں۔

اسلام آباد مسلم لیگ کی صدر کی حیثیت سے مجید بھائی کا سب سے اہم کارنامہ اسلام آباد کی جھونپڑیوں میں رہنے والے خستہ و پریشان حال مہاجروں کے لئے ایک متبادل جگہ (ڈرگ کالونی) شاہ فیصل کالونی کا حصول تھا جو اس وقت ایک بنجر اور ویران علاقہ تھا۔ اس علاقے کی حصولیابی کی تگ و دو میں مجید بھائی کو نواب زادہ لیاقت علی خان اور نواب صدیق علی خاں سے جو اس وقت پولیٹیکل سکریٹری تھے متعدد بار ملاقاتوں کا موقع ملا۔ کالونی کے حصول میں جن رفیقوں کا ان کو تعاون حاصل رہا ان میں قاضی غلام یٰسین فاروقی، سید اشرف علی گوالیاری مرحوم شیخ عبدالصمد لے چین، غیاث الدین فاروقی اور شیخ بابو گوالیاری قابلِ ذکر ہیں۔

مجید بھائی نے اگرچہ سیاست سے عملاً کنارہ کشی اختیار کر لی ہے لیکن وہ ذہنی طور پر آج بھی مسلم لیگ کے سیاسی مسلک اور اس کے اصول و عقائد سے گہری وابستگی رکھتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ مسلم لیگ ہی وہ واحد جماعت ہے جو پاکستان کے استحکام اور یک جہتی کے لئے آج بھی فعّال ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ یہ جماعت ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائے۔

مجید بھائی ۱۹۳۰ء سے یعنی اپنے طالبِ علمی کے زمانے سے شعر کہہ رہے ہیں۔ شاعری کی طرف ان کی قدرتی اور طبعی میلان کا اندازہ ان کی پہلی غزل کے چند اشعار سے لگایا جا سکتا ہے جو بطور نمونہ یہاں پیش کیے جا رہے ہیں ؎

کیوں کہوں گلشن کو گلشن، فصلِ گل کو فصلِ گل
پتّے پتّے سے نظر آتی ہے ویرانی مجھے

ہر قدم پر اک نئی منزل کی پڑتی ہے بنا
مشکلاتِ راہ نے بخشی ہے آسانی مجھے

ایک ہی ساغر میں ساقی نے کہاں پہنچا دیا
موجِ بادہ بن گئی ہے موجِ طوفانی مجھے

جوشِ وحشت میں کہاں آرام و کلفت کی تمیز
سنگ اندازئ طفلاں ہے گُل افشانی مجھے

۱۹۳۵ء کے بعد مُسلم لیگ کی تحریک ایک واضح تاریخی دور میں داخل ہو گئی تھی اس حوالے سے مجید بھائی کی سیاسی ذمہ داریوں میں اس قدر اضافہ ہو گیا تھا کہ شعر و شاعری کے ذوق کی تکمیل کے لئے انھیں وقت نکالنا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ قطعی غیر ممکن تھا۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد بھی وہ اپنی سیاسی مصروفیات کے باعث اس کی طرف رجوع نہ ہو سکے جیسا کہ اُوپر بیان ہوا ہے۔ تاہم وہ ۱۹۶۸ء میں دوبارہ شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے اور باقاعدہ حضرت شاعر لکھنوی کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام "زخمِ بہاراں" شائع ہوا، دوسرا اب "حرفِ آگہی" کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے مجید بھائی کے اس مجموعے کو بھی پہلے مجموعے کی طرح قبولِ عام حاصل ہو گا اور یہ شعری روایات میں نئے امکانات اور نئی جہتوں کی نشاندہی کریگا۔

کراچی
۳۱ مئی ۱۹۸۳ء

اپنے آئینے میں

میری عمر ۷۰ سال سے تجاوز کر چکی ہے جن میں ۴۵ سال مذہبی و سماجی خدمات "لسانی کشمکش" تحریک پاکستان کی جدوجہد اور قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد کے حصول میں گزرے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کے خلاف برطانوی سامراج، انڈین نیشنل کانگریس اور ہندو مہاسبھا کا مشترکہ محاذ غیر معمولی تھا لیکن اس کے مقابل اقلیتی صوبوں کے نہتّے مسلمانوں کا اجتماعی ردّعمل اور جوش و خروش بھی کم حیرت انگیز نہ تھا۔ میری طرح ہزاروں مسلم طلباء کا زمانۂ طالب علمی اور عہدِ شباب تحریک پاکستان کی نذر ہو گئے۔ اربوں روپے کی جائدادیں اور اثاثے ہجرت کے وقت چھوڑنے پڑے اور بلاامتیاز مرد و زن لاکھوں مسلمان آگ اور خون کے سمندر میں غرق ہو گئے۔ تب کہیں عروس آزادی کا دیدار نصیب ہوا۔ یوں بھی زندگی مسلسل جدوجہد اور پیہم کشمکش سے عبارت ہے۔ الغرض میرا شمار بھی ان بدنصیبوں میں ہے جو علوم و فنون سے بے بہرہ اور اپنی ذات میں ناکام رہے ہیں۔ البتہ تلخ تجربات اور جاں سوز مشاہدات جو گرد و پیش بکھر کے رہ گئے ہیں۔ اس طویل صبر آزما سفر کا حاصل ہیں۔ انہی تلخ و شیریں یادوں کا دوسرا نام "زخم بہاراں" ہے۔ جو فروری ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آ کر غیر متوقع طور پر اس حد تک شرفِ قبولیت حاصل کر چکا ہے کہ اس کے اجرا اور چند تعارفی تقریبات کے بعد ۳ برسوں کی قلیل مدّت میں بازار سے غائب ہو گیا۔ قطع نظر حسن و قبح کے اس کی بڑی وجہ اخبارات و رسائل کا حوصلہ افزا تعاون ہے خصوصاً روزنامہ حرّیت، روزنامہ مساوات، روزنامہ مشرق، روزنامہ جنگ،

روزنامہ صداقت، روزنامہ انگلش ڈان، روزنامہ مارننگ نیوز، ماہنامہ جامِ نو کراچی، نئی قدریں حیدرآباد اور پاکستان ریڈیو کے جریدہ "آہنگ" نے نہ صرف اپنے ادبی صفحات میں مناسب جگہ دی بلکہ مسلسل ایک سال سے زائد عرصہ تک وقفے وقفے سے جامعہ کراچی، جامعہ سندھ اور دیگر کالجوں کے نامور پروفیسروں، واجب احترام دانشوروں اور مستند ناقدوں کے طویل تبصرے، مقالے اور بے لاگ تنقیدیں شائع کرتے رہے۔ اس کے علاوہ "زبان ہند" کانپور کے مدیر اعلیٰ جناب شارق ایرایانی نے بھی تبصرہ فرمایا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ پبلک ریلیشنز سے میرا تعلق نہ کبھی تھا نہ اب ہے۔ تاہم ان سب کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشا۔

ایسے وسیع پیمانے پر تعارف کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ پاکستان کے شمالی علاقوں اور بھارت سے "زخم بہاراں" کی فراہمی کا شدت سے مطالبہ شروع ہو گیا۔ اس سے متاثر ہو کر ہم عصروں کا مخلصانہ مشورہ تھا کہ "زخم بہاراں" کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر لایا جائے۔ ان کا مشورہ خلوص و محبت پر مبنی تھا۔ میں ان کے جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر اس کا کیا علاج کہ عرصۂ دراز سے "شاعر اور تنگ دستی" میں چولی دامن کا ناقابل شکست رشتہ چلا آ رہا ہے۔ اس وقت مجھے اپنے ایک مرحوم ساتھی محمد یوسف خاں یوسف کا وہ شعر یاد آ رہا ہے جو انھوں نے آج سے ۴۵ سال قبل کھام گاؤں کے ایک طرحی مشاعرے میں سنایا تھا یہ میری ترجمانی کے لئے بہت کافی ہے ؎

ہمّت ہے اور طاقتِ پرواز ہے مگر
مجبور ہو گئے ہیں فقط بال و پَر سے ہم

بالآخر بصد غور و خوض مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ "زخم بہاراں" کو دوبارہ شائع کرنے کے بجائے اس کی کچھ غزلوں کو ایسی ترمیم اور اضافے کے ساتھ پیش کیا جائے کہ ان میں گرد و پیش کی صحیح عکّاسی ہو، اور جن کا بے باک لیکن شائستہ لہجہ ایک طرف قارئین کو دعوتِ فکر دے سکے تو دوسری طرف طالبانِ زخم بہاراں کو بھی مطمئن کر سکے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میری یہ کوشش

کہاں تک شرف پسندیدگی حاصل کرے گی۔ یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ تقسیمِ ہند سے پہلے مہاراشٹر، گجرات، میسور، مدراس، اُڑیسہ، متحدہ بنگال اور آسام کے مسلمانوں نے اپنے مادری زبانوں کے مقابلے میں بہ رضا و رغبت "اُردو" کو ترجیح دینے میں فخر محسوس کیا تھا اور بنگال میں تو "اُردو" کو احتراماً "نبی جی کی بھاشا" کہا جاتا ہے۔ وہی احترام آج بھی میری ذات میں موجزن ہے۔ میں اہلِ زبان ہوں نہ انشاء پرداز۔ لیکن مجھے اُردو سے اس کی ہمہ گیر خوبیوں کے باعث بے اِنتہا محبّت ہے۔ میں نے بھی حسبِ استطاعت برسوں سے اس کی نشو و نما میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔

یہاں اس حقیقت کے اظہار پر حیرت نہ ہونی چاہیئے کہ آج سے تقریباً ۱۲۵ سال قبل یعنی ۱۸۵۷ء تک میرے آبا و اجداد کی مادری زبان فارسی تھی اور وہ نسلاً پٹھان تھے۔ یہی وہ مجاہدینِ آزادی تھے جنھیں انگریزوں نے "پنڈاریوں" کے لقب سے نوازا تھا۔ جنگِ آزادی میں شکست کے بعد شاید قتلِ عام سے بچنے کے لئے انھوں نے اپنے آپ پر "شیخ" کی چھاپ لگالی تھی، اور مراٹھی زبان سے گھل مل گئے تھے (جان کتنی پیاری ہوتی ہے) چنانچہ میری مادری زبان "مراٹھی" ٹھہری۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ شعر و سخن سے فطری لگاؤ ہونے کے باوجود میں احساسِ کمتری میں مبتلا تھا۔ اس پر طرفہ یہ کہ مجھ کو صنفِ غزل اِسی لئے پسند ہے کہ یہ محبوب کے مزاج کی طرح نازک اور لطیف ہے، سادگی اور شائستگی اس کے زیور ہیں، اپنی قامت پر نرم و سُبک الفاظ کا خوش نما مرمریں لباس پسند کرتی ہے اپنے لب و رُخسار کے حُسن کو نکھارنے کے لئے شاعر کے خونِ جگر کا غازہ چاہتی ہے، لہٰذا نرم و نازک اسلوب ہی سے اس کو رام کیا جاسکتا ہے۔ یہ جھاڑ جھنکار، کچرا کوڑا اور گھر گھراہٹ جیسے ثقیل اور کرخت الفاظ کی متحمّل نہیں ہوسکتی۔ ان اوصاف سے مزیّن ہونے کے بعد ہی یہ کم سے کم لفظوں میں دریائے معانی بھر دیتی ہے۔ بہر حال ان حالات میں جلد یا بہ دیر میں حضرت شاعر لکھنوی صاحب کے دامن سے وابستہ ہوگیا۔ میں نے جو اِستفادہ ان سے

کیا ہے "زخمِ بہاراں" اس کا آئینہ ہے اور اب "حرفِ آگہی" قارئین کے پیشِ نظر ہے۔ وہ اس کے متعلق اپنی رائے معین کرنے میں آزاد ہیں۔

غزل پر قدامت پسندی کا الزام غلط ہے۔ صدیوں کے تجربے شاہد ہیں کہ یہ بڑی سخت جان ہے اور اپنے اندر بلا کی لچک بھی رکھتی ہے۔ عشق و محبت ہی اس کی جولانگاہ نہیں ہے۔ اسے ہر دور میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کی نمائندگی کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت حاصل رہی ہے بشرطیکہ اس کا صحیح منصب نظر میں رہے۔ میرے دونوں مجموعے اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ پھر بھی اگر کہیں سہو ہو گیا ہو تو اس کی نشان دہی کا خیر مقدم کروںگا۔

بڑی ناشکر گزاری ہوگی اگر اس موقع پر میں اپنے محترم دوست جناب مقبول نقش صاحب کا ذکر نہ کروں کہ جب کبھی مجھے حضرت شاعر لکھنوی صاحب سے رابطہ قائم کرنے میں وقت لگا تو اس دوران انھوں نے مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔

آخر میں اپنے قارئین و ناظرین کی توجہ اس تلخ حقیقت کی جانب مبذول کراتا ہوں کہ اُردو کو تادمِ تحریر قومی زبان کا درجہ عملاً حاصل نہ ہو سکا۔ قطع نظر اس بحث کے کہ اس تغافل کیشی کا کون ذمہ دار ہے اور کون نہیں ہے، پاکستان بھر کے اُردو اخبارات و رسائل کے علاوہ پاکستان کی نشرگاہوں، ٹی وی مرکزوں اور اُردو کے دانشوروں، فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں نے اپنے عالمِ بے سروسامانی میں بھی پشاور سے کراچی اور ملتان سے کوئٹہ تک اردو کو عوامی زبان بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان سب کی خدماتِ جلیلہ قابلِ قدر و لائقِ تحسین ہیں۔ اگر چاپلوسی اور خوشامد پر محمول نہ کیا جائے تو یہ آثار بھی کم حوصلہ افزا نہیں ہیں کہ موجودہ فوجی حکومت کے سربراہ اور ان کے رُفقائے کار، سرکاری و غیر سرکاری اور بین الاقوامی سطح (فورم) پر بھی اُردو کو رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ کاش یہ لوگ اپنے عہد ہی میں اُردو کو آئینی طور پر عملاً قومی زبان کا درجہ دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ آمین!

میرے لئے موجبِ مسرت ہے کہ حضرت شاعر لکھنوی، حضرت شور علیگ، ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور ڈاکٹر حنیف فوق نے "حرفِ آگہی" کو اپنی جامع اور گراں قدر آرا سے نوازا ہے۔ میں ان حضرات کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔

اس موقع پر برادر عزیز جناب خورشید احمر میری دعاؤں اور نیک تمناؤں کے مستحق ہیں۔ جنھوں نے اس شعری مجموعے کو معنوی اعتبار سے دیدہ زیب بنانے میں نہ صرف مجھ سے تعاون کیا بلکہ میرے بارے میں مختصر کوائف و حالات لکھ کر اس کتاب کی افادیت کو اور مؤثر بنا دیا ہے۔

جناب وثیق افضل، جناب مشرف حسین، جناب سید محمد حسن عسکری زیدی خادم ایرایانی اور جناب حکیم عبدالرحیم خاں کا بھی سپاس گزار ہوں کہ جنھوں نے اس مجموعے کی ترتیب و تزئین اور کتابت و آرائش میں میری بھرپور مدد کی اور قیمتی مشورے دیئے۔

پاکستان میں جن شاعر دوستوں کے خلوص اور محبت نے مجھے زندہ رہنے اور ادبی سفر کے جاری رکھنے کا حوصلہ بخشا۔ ان میں غلام مصطفےٰ ناز منیجر گرنڈلیز بینک، شارب قریشی ناگپوری، سعید وارثی صدر مرکزی مجلس سماجی کارکنان پاکستان، اقبال محزون، رشید گوالیاری، صابر براری، زبیر احمد عثمانی، شوق گوالیاری، احسان کاکوروی، ماسٹر جبیں قدر، کاشف بالاپوری، شفیع برہانپوری، معین طالب رائے پوری اور شیخ عبدالصمد بے چین قابل ذکر ہیں اور محترم بھی۔

ہندوستان میں اُردو کی اشاعت و ترویج اور میری فکری و شعوری مہم جوئی میں جن بزرگوں کی سرپرستی و رہنمائی حاصل رہی ہے ان میں سید عبدالرؤف شاہ عاصی صدر سابق سی پی و برار مسلم لیگ، (خان صاحب) عبدالرحمٰن خاں بانی انجمن ہائی اسکول کھام گاؤں، نواب صدیق علی خاں مصنف "بے تیغ سپاہی"، محمد سرفراز خاں سابق پرنسپل انجمن ہائی اسکول کھام گاؤں، محمد حیات خاں مظہر مرتضیٰ پوری، عبدالکریم شائق کھام گانوی، حبیب الرحمٰن صدیقی میرٹھی، قیصر بدنیروی، امیر قریشی اکولوی، ماسٹر بشیر احمد شہید، عبدالحکیم ذاکر کھام گانوی، خلیل شارق نیازی امراؤتی اور مصور کارنجوی ناقابل فراموش ہیں۔

اِس ضمن میں جن دوستوں کی رفاقت میسّر رہی ہے اور اَب جن کی یادیں میرا قیمتی اَثاثۂ حیات بن چکی ہیں ان میں محمد ضیاء الحق خاں معتمد اعزازی انجمن مفید الاسلام کھام گاؤں، شاعرِ "متاعِ احساس" غلام حسین رازؔ بالاپوری، منشاء الرّحمٰن خاں منشاؔ، سابق صدر شعبۂ اُردو و فارسی ناگپور یونیورسٹی محترمہ خالدہ خانم، محمد ابراہیم خاں فناؔ، مولوی اسرار احمد کریوی، سلطان احمد کانپوری، ہادیؔ نقشبندی علیگ جاگیردار بالاپور، شاعر مجموعۂ کلام "زاویئے" اسمٰعیل خاں طالبؔ آکولوی، شاعر "مشاہدات" عبدالرؤف شاہدؔ آکولوی، عبدالجلیل کھٹکھٹے ناگپوری، محمد حنیف صاحب حنیفؔ مرحوم کھام گانوی اور جمال احمد خاں دُرّانی بلڈانوی مرحوم نمایاں ہیں۔

مجیدؔ کھام گانوی

ہر ایک لفظ روشنی دے گا

مقبول نقشؔ

ترا ہنر کہ بہر رُخ ہے کامیاب مجیدؔ
خیال و فکر ہے، جذبہ ہے اور فن بھی ہے
ہے یہ بھی ایک حقیقت کہ تیرے شعروں میں
زباں کا حسن ہے، لہجے کا بانکپن بھی ہے

ترے کلام کے پہلو کئی ہیں، رنگ کئی
فقط غزل ہی نہیں، گو غزل کی بات بھی ہے
زہے شعورِ حقائق، زہے شعورِ حیات
ہر ایک شعر میں فکر و عمل کی بات بھی ہے

تو غور کرتا ہے انسان کے مسائل پر
بڑے خلوص و محبّت سے، دردمندی سے
ترے کلام کو پڑھ کر یہی ہوا محسوس
کہ دے رہا ہے صدائیں کوئی بلندی سے

نثار میں ترے اندازِ کج کلاہی کے
خرابِ عشق ہوا، ننگِ عاشقی نہ ہوا
ہر ایک موڑ پہ اظہارِ حق ترا مسلک
شکارِ مصلحتِ وقت تو کبھی نہ ہوا

مجیدؔ خونِ جگر تیرا رنگ لایا ہے
کہ جگمگاتے ہیں ایوانِ شاعری کے چراغ
ہر اک خیال، ہر اک لفظ روشنی دے گا
جلا کریں گے یوں ہی حرفِ آگہی کے چراغ

۱۹۸۳ء

فہرست

منقبتیں :-

سلام :-

غزلیں :-

نظمیں :-

Scanned by CamScanner

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حمد و ثنا

فرضِ حمد و ثنا ہو کس سے ادا
ایک قطرہ کہاں، کہاں دریا
جُز سے ممکن نہیں اِحاطۂ کُل
دیکھئے! پھر بھی حوصلہ دِل کا

ذرّہ ذرّہ ہے رو کشِ خورشید
چشم خیرہ ہے، عقل حیراں ہے
وجہِ حیرت ہے، یہ جہانِ وجود
اِک اِشارے پہ تیرے رَقصاں ہے

آئینہ ہے یہ کائنات اس میں
خود کو دیکھوں کہ مَیں تجھے دیکھوں
تیرے شہکار تو ہزاروں ہیں
اتنی مہلت کہ غور سے دیکھوں

مرے وجود میں میرا نہیں ہے کوئی کمال
ترا ہی حُسنِ نظر ہے، ترا ہی حُسنِ خیال
اُٹھا کے ذرّے کو تو نے بنا دیا خورشید
ترا جواب نہیں ہے، تری نہیں ہے مثال

ہو بزمِ خاک نشیناں کہ محفلِ انجم
ہیں تیری جلوتِ خاطر کی واسطے بے چین
مگر یہ سوچ کے چپ ہیں کہ اِک جھلک سے تری
دُھواں نہ کہیں ہو، تجلیِ کونین

رحمت اللعالمینؐ

رسالت ختم ہے جن پر، وہ ختم المرسلیں آئے
ہے نازاں انتہا جن پر وہ نورِ اوّلیں آئے
فقط وہ اک جہاں کی دستگیری کو نہیں آئے
وہ آئے اور بن کر رحمت اللعالمیں آئے
فرازِ عرش سے سلطانِ دیں سوئے زمیں آئے
محبّت اس کو کہتے ہیں جہاں ہم تھے وہیں آئے
وہ رشکِ یوسفِ کنعاں، حسینوں کے حسیں آئے
وہ کملی پوش اُمّی، محرمِ علمِ یقیں آئے
وہ جن کا نطق، اہلِ عشق پر مثلِ گہر برسے
مگر اہلِ ہوس کو جن پہ مشکل سے یقیں آئے

نجاتِ خانۂ کعبہ ہوئی جھوٹے خداؤں سے
اندھیرا چھٹ گیا ظلمت مٹی ماہِ مبیں آئے
انھیں بھی سوزِ جاں حاصل ہوا شمعِ رسالت سے
ہزاروں بجلیاں لے کر جو زیرِ آستیں آئے
وہ جن کی خاکِ پا کا ذرّہ ذرّہ طورِ سینا تھا
قدم لینے کو ان کے عرش سے رُوح الامیں آئے
مجیدؔ آنکھوں نے دیکھا یہ بھی گوشہ ان کی سیرت کا
حجابِ فقر میں شاہنشہِ دنیا و دیں آئے

بہ اہتمام، خدا بھی نبیؐ سے ملتا ہے
مقامِ عظمتِ انساں اسی سے ملتا ہے

طلوعِ فیضان

کچھ اس اَدا سے نفس نفس کو نبیؐ کا عرفان ہو رہا ہے
حیات پر لمحہ جیسے، نزولِ قرآن ہو رہا ہے
وہ دل کی آنکھوں کے روبرو ہیں طلوعِ فیضان ہو رہا ہے
شعور پر بارشِ کرم ہے، نظر پہ احسان ہو رہا ہے
وہی ہیں سرمایۂ محبّت، وہی ہیں پیمانۂ شریعت
زباں سے تائید ہو رہی ہے دلوں سے پیمان ہو رہا ہے
درود ہونٹوں پہ ہے ہمارے حضور خود سامنے کھڑے ہیں
نفس نفس میں وہ روشنی ہے کہ تازہ ایمان ہو رہا ہے
ملائکہ ہی کا ذکر کیا ہے، خدا ہے مصروفِ جشن خود بھی
یہ کون تشریف لا رہا ہے، یہ کون مہمان ہو رہا ہے

اِدھر ہے یہ حال زندگی کا، جھکی ہیں شرمِ گنہ سے آنکھیں
اُدھر ہیں بے تاب میرے آقا، کرم کا سامان ہو رہا ہے
شکستِ وہم و گماں ہی کہیئے نہ کہ یک معجزہ سمجھئے
کہ بُت شکن پر بھی آزر بھی آج قربان ہو رہا ہے

آئینہ

جو دل، عشقِ نبیؐ کا آئینہ ہے
شعورِ زندگی کا آئینہ ہے
جمالِ شاہِ بطحیٰ، اللہ اللہ
مقابل روشنی کا آئینہ ہے
جو روشن ہے مرے داغِ جبیں میں
انہی کی بندگی کا آئینہ ہے
جسے کہتے ہیں میکش، جامِ کوثر
تری دریا دلی کا آئینہ ہے
متِ دل ہو کیوں ان کو گوارا
کہ دل بھی تو انہی کا آئینہ ہے

خدا شاہد ہے صورت مصطفےٰؐ کی
خدا کی آگہی کا آئینہ ہے
مجیدؔ ان کا حریم نور و نکہت
کمالِ آدمی کا آئینہ ہے

سفر ہے

سفر ہے مدینے کی جانب سفر ہے
چراغاں چراغاں مری رہ گذر ہے
ابوجہل کیا رتبۂ نور سمجھے -
نظر اس کو کیا آئے جو بے بصر ہے
سرِ عرش جا کر بھی وہ لوٹ آئے
زمانہ ابھی ماہ و مرّیخ پر ہے
علاوہ مدینے کے ہر ایک منظر
فریبِ نظر ہے، فریبِ نظر ہے
اسی آئینے کا ہے یہ اک کرشمہ
مرے سامنے آج آئینہ گر ہے

ہے پہروں اسی زلف و رُخ کا تصوّر
یہی مشغلہ اپنا شام و سَحر ہے
یہ کِس دَر پہ لے آیا ذوقِ عبادت
نہ احساس سجدہ نہ احساس سر ہے

منقبت

حضرت فاروقِ اعظمؓ

خدا سے باخبر، خود آشنا فاروقِ اعظم ہیں
ہر اک حرفِ شریعت کی صدا فاروقِ اعظم ہیں
جو فتنہ ہیں انھیں تیغِ فنا فاروقِ اعظم ہیں
جو تشنہ ہیں انھیں آبِ بقا فاروقِ اعظم ہیں

خدا خود جس کا شیدائی زمانہ جس کا سودائی
اسی حُسنِ مجسّم کی اَدا فاروقِ اعظم ہیں
نہیں ہے اِک شکن بھی جن کے دامانِ عقیدت میں
حریمِ خاص کا وہ آئینا فاروقِ اعظم ہیں
انھیں کے دم سے آوازِ اَذاں گونجی ہے کعبے میں
ہِ اسلام میں بانگِ درا فاروقِ اعظم ہیں

نہ ہو کیوں عکسِ آدابِ نبوّت ان کے پیکر ہیں
کہ خورشیدِ رسالت کی ضیا فاروقِ اعظم ہیں
عجب انداز سے ہیں جلوہ گر تختِ عدالت پر
توازن عدل کی میزان کا فاروقِ اعظم ہیں
مجیبؔ ان کو خدائے پاک سے مانگا محمدؐ نے
دعا فاروقِ اعظم، مدّعا فاروقِ اعظم ہیں

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

جو بات سچ ہے اُسے سچ ہی جانِ من کہیئے
تباہ کِس نے کیا فاطمی چمن کہیئے؟

زبان رکھتی ہے پھولوں کی بے زبانی بھی
سکوتِ حرف کو پیرائیہ سخن کہیئے

علی کا فقر تو اَب تک زبانِ خلق پہ ہے
مگر کہاں ہے وہ شاہوں کا بانکپن کہیئے

چراغِ بزم ولایت ہے وہ گُلِ خوبی
بجا ہے اس کو اگر جانِ انجمن کہیئے

وہ بابِ علم ہے، وہ آگہی کا محور بھی
تو کیوں نہ پھر اُسے معراجِ فکر و فن کہیئے

وہ ایک پیکرِ عجز و نیاز ہے کہ جسے
جلالِ فقر، ولایت کا بانکپن کہیے
اسی گلاب سے مہکا ہے باغِ مصطفوی
اسی گلاب کو صد نازشِ چمن کہیے

سلام۔

سیدالشہداء حضرت امام حسینؓ پر سلام

سلام اس پر کہ جس نے مسکرا کر جان ہی دے دی
سلام اس پر کہ جس کو موت نے خود زندگی دے دی

سلام اس پر کہ جس کو بے قراری میں قرار آیا
خزاں کے دور میں جو لے کے پیغامِ بہار آیا

وہ اک ٹھیرا ہوا صبر و شکیبائی کا دریا تھا
وہ طوفانوں میں جیسے استقامت کا ہمالا تھا

وہ صورت اور سیرت میں پیمبرؐ کا نمونا تھا
جسے ختم الرسلؐ نے اپنے ہاتھوں سے سنوارا تھا

اسی دن کے لئے شاید اسے فطرت نے پالا تھا
حسینی قافلے کو کربلا میں آکے لٹنا تھا

اگر چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا وہ بھی کرلیتا
برنگِ مصلحت، باطل سے سودا وہ بھی کرلیتا
جو پردا سچ کے چہرے پر گوارا وہ بھی کرلیتا
ذرا سی دیر کو تقلیدِ دُنیا وہ بھی کرلیتا

تو پھر رنگِ وفا، رنگِ زمانہ اور ہی ہوتا
تمنّاؤں کے ہونٹوں پر ترانہ اور رہی ہوتا
یہ دُنیا اور اس کا کارخانہ اور رہی ہوتا
حقیقت اور رہی ہوتی، فسانہ اور رہی ہوتا

کفن باندھے ہوئے سر سے مگر وہ صبر کا پیکر
بہتّر سرفروشوں کا لئے چھوٹا سا اِک لشکر
سرِ مقتل دِکھایا، زندگی کو موت کا منظر
خدا کو کرلیا راضی، عدو کو اپنا سر دے کر

مقابل لشکرِ جرّار تھا، باطل پرستوں کا
مگر عزم و یقیں تھا دیدنی اللہ والوں کا

کوئی آساں نہیں راہِ خدا میں اپنا سر دینا
اصولوں کے لئے جینا، اصولوں کے لئے مرنا

ہے جب تک احترامِ عظمتِ انسانیت زندہ
حسین ابنِ علی کا نام ہے دُنیا میں پائندہ

یہ منزلت، یہ عقیدت، یہ عظمتِ حرمین
نثار جس کے تقدّس پہ دولتِ کونین
نہ جانے ان کی زیارت کے واسطے کب تک
رہوں گا ماہیِ بے آب کی طرح بے چین

غزلیں

حیات آ نہ سکی ان کو سازگار کبھی
جو بن سکے نہ تری راہ کا غبار کبھی

ترے خیال سے ہٹ کر، تری نظر کے بغیر
نہ آسکا مجھے خود پر بھی اِعتبار کبھی

نَفَس نَفَس پہ تلاطم کا جن کو خوف رہا
ہوئے نہ عشرتِ ساحل سے ہمکنار کبھی

چمن چمن، گل و لالہ کی سُرخیاں اُبھریں
مرے لہو سے نہ خالی رہی بہار کبھی

ابھی ہے طوق و سلاسل کا مرحلہ درپیش
بنیں گے دار و رسن بھی گلے کا ہار کبھی

رَوِش رَوِش کو لہو دے کے کر دیا گل رنگ
دھواں دھواں نظر آئی اگر بہار کبھی

مجیدؔ آج بھی نشتر سے دِل پہ لگتے ہیں
کیا تھا میں نے بھی اپنوں پہ اِعتبار کبھی

ہوئے ہیں اہلِ نظر جانے کس دیار میں گم
چراغ سوگ میں ہیں، بزمِ انتظار میں گم

کسی نے کیا کرم میرِ کارواں کہیے
نہ جانے کتنے مسافر ہوئے غبار میں گم

کچھ ایسا بے خودیِ شب کا سلسلہ ہے کہ لوگ
سحر کو بھی ہیں، چراغوں کے انتظار میں گم

غریب کس سے تبسّم کا فلسفہ پوچھے
امیرِ شہر تو ہے اپنے کاروبار میں گم

سبھی سفر میں ہیں، یہ اپنی اپنی قسمت ہے
کسی کے سامنے منزل، کوئی غبار میں گم

ترا یہ نظمِ چمن باغباں، ہمیں تسلیم
مگر وہ پھول ہوئے جو بھری بہار میں گم

مجیدؔ کتنے ہی دل ہیں جوابِ لالہ و گل
مگر نظر ہے تری اپنے شاہکار میں گم

اور کیا وہ ہمیں زخموں کے سِوا دیتے ہیں
ہم کو دیکھو، انھیں پھولوں کی قبا دیتے ہیں

کارِ تعمیرِ عبارت ہے اب ان لوگوں سے
جو فقط راہ میں دِیوار اُٹھا دیتے ہیں

ناز ہوتا ہے بہت اپنی بصیرت پہ جنھیں
ایسے لوگوں کو ہم آئینہ دِکھا دیتے ہیں

آپ بھی شہرِ چراغاں سی گزر کر دیکھیں
کتنے گھر ہیں جو اندھیروں کا پتا دیتے ہیں

میرے چہرے ہی سے ہو سکتا ہے اندازۂ دِل
گھر کی حالت در و دِیوار بتا دیتے ہیں

سِلسلہ کم نہیں ہوتا ترے دِیوانوں کا
دار پر روز نئی شمع جلا دیتے ہیں

عصرِ حاضر میں مسیحا انھیں کہتے ہیں مجیدؔ
سانس لینا بھی جو دُشوار بنا دیتے ہیں

بنے نہ بات تو اظہارِ مدّعا کیا ہے
جو منزلوں پہ نہ پہنچے وہ راستا کیا ہے

ہوا جو غرق سفینہ پہنچ کے ساحل پر
تو ناخدا کو پتہ چل گیا، خدا کیا ہے

اسی سے دہر نے پایا سُراغ منزل کا
چراغ راہ کا ہے میرا نقش پا کیا ہے

سکوں کی چھاؤں میسّر، نہ پیار کا سایہ
حیات ایک کڑی دھوپ کے سوا کیا ہے

قریب سے وہ گزر جائے اجنبی کی طرح
میں سوچتا ہوں کہ اِس سے بڑی سزا کیا ہے

وہ شخص جس کی نزاکت پہ لوگ مرتے ہیں
دِلوں کو توڑ دیا اُس نے آئینا کیا ہے

تصوّرِ غمِ جاناں کا راستہ روکے
مجیدؔ گردشِ دوراں کا حوصلا کیا ہے

نیرنگیٔ نظامِ گلستاں تو دیکھئے
اُڑتا ہوا سا رنگِ بہاراں تو دیکھئے

اک اک کلی کی اوٹ سے تو دے رہے ہیں زخم
یہ اہتمامِ جشنِ چراغاں تو دیکھئے

ہر آئینے پہ اپنی تمنّا کا ہے گماں
رنگِ طلسمِ عالمِ اِمکاں تو دیکھئے

ہر شاخ کی گرفت میں کچھ برگِ زرد ہیں
سرمایۂ بہارِ گریزاں تو دیکھئے

سورج کو قید کر دیا گرد و غبار میں
یہ آندھیوں کا کارِ نمایاں تو دیکھئے

ہر چند دیدہ زیب ہے صبحِ وطن مگر
آپ آ کے میری شامِ غریباں تو دیکھئے

پھر کیجئے گا، چاکِ گل و لالہ پر نگاہ
پہلے مجیدؔ اپنا گریباں تو دیکھئے

اِحساس میں جو حرفِ تمنّا کی طرح ہیں
زنداں میں وہی یوسفِ تنہا کی طرح ہیں

رکھو جو ہتھیلی پہ تو بے نور ہیں غنچے
شاخوں پہ مگر دیدۂ بینا کی طرح ہیں

ان کا تو فقط نام ہے، صورت نہیں کوئی
اربابِ وفا دہر میں عنقا کی طرح ہیں

لے جائیں نہ طوفاں کو بھی موجوں میں بہا کر
ہم لوگ کہ چڑھتے ہوئے دریا کی طرح ہیں

یہ دیکھ کے حیرت ہے زمانے کی نظر کو
قاتل کے بھی انداز مسیحا کی طرح ہیں

لَو دیتے ہیں جو شمع کی صورت سرِ منزل
راہوں میں وہی نقشِ کفِ پا کی طرح ہیں

وہ غم جو مجیدؔ اُس نگہِ ناز نے بخشے
میرے لئے وہ بھی غمِ دُنیا کی طرح ہیں

ہم سر بکف جو کوچۂ جاناں میں آ گئے
کتنے شگاف، سینۂ دوراں میں آ گئے

آنکھیں کھلیں تو چاک تھے پھولوں کے پیرہن
ہم بھی فریبِ صبحِ بہاراں میں آ گئے

ہر سمت ایک دار ہے، ہر گام اک صلیب
کیا ہم حدودِ شہرِ نگاراں میں آ گئے

جوشِ جنوں کا حال عجب تھا بہار میں
سب اہلِ شہر کھنچ کے بیاباں میں آ گئے

مَیں نے گلوں کی طرح انھیں بھی رکھا عزیز
کانٹے الجھ کے جو مرے داماں میں آ گئے

دیکھا جو سرفروشوں کا اک جشن سا بپا
مقتل سے لوگ کوچۂ جاناں میں آ گئے

یہ نسبتِ جنوں بھی عجب چیز ہے مجید
پھولوں کے چاک میرے گریباں میں آ گئے

ہمارے حال پہ کچھ لوگ مسکرائے ہیں
یہی تو ہیں جو نئے زخم دینے آئے ہیں

مقامِ شکر ہے گلشن میں روشنی تو ہوئی
یہ اور بات نشیمن بھی زد پہ آئے ہیں

ہوائے تیز سے ہم ہو سکیں گے کیا مرعوب
کہ آندھیوں میں بھی ہم نے دیئے جلائے ہیں

مآلِ کارِ محبّت، خیالِ ترکِ وفا
کہاں پہنچ کے مرے پاؤں ڈگمگائے ہیں

خزاں کے دَور کی تاریخ کیا بتائے گی
بھری بہار میں پھولوں نے زخم کھائے ہیں

بس اک گہر کا ہے چشمِ صدف کو اتنا ملال
ہماری آنکھ نے کتنے گہر لٹائے ہیں

مجیدؔ اُن کی خوشی ہی تو حاصلِ غم تھی
اسی لئے تو زمانے کے غم اُٹھائے ہیں

زخموں کے کچھ گلاب فروزاں ہوئے تو ہیں
پھولوں کی انجمن میں چراغاں ہوئے تو ہیں

مانا کہ ہم بہار کا اِک زخم ہی سہی
گُل بن کے شاخ شاخ نمایاں ہوئے تو ہیں

کیا چاہتی ہے اور یہ نیرنگیٔ بہار
ہم دل پہ زخم کھا کے نمایاں ہوئے تو ہیں

اَے زُلفِ یار! چاہیئے اِسکا بھی اِعتراف
تیرے سبب سے لوگ پریشاں ہوئے تو ہیں

دیکھو! اُنھیں میں حضرتِ واعِظ نہ ہوں کہیں
کچھ لوگ میکدے سے گریزاں ہوئے تو ہیں

اَہلِ جنوں کا بس یہی اِعزاز ہے بہت
اَہلِ خِرَد سے دَست و گریباں ہوئے تو ہیں

ڈالی ہے اُس نے اِک نگہِ لُطف اَے مجید
دِل کے مُعاملات کچھ آساں ہوئے تو ہیں

مِلی جو فرصتِ یک لمحہ زندگی کے لئے
ہزار کام نکل آئے آدمی کے لئے

وہ زندہ لوگ ہیں ٹھکرا کے جو حوادث کو
نکالتے ہیں نئی راہ آدمی کے لئے

جو اہلِ دِل ہیں ترے غم کی قدر کرتے ہیں
یہ اِک چراغ ہی کافی ہے روشنی کے لئے

کوئی تڑپ، کوئی ہلچل نہ کوئی ہنگامہ
سکوں بھی ایک قیامت ہے آدمی کے لئے

عتابِ دوست کہاں سب کو راس آتا ہے
یہ زہر، قند ہے لیکن کسی کسی کے لئے

ہمارا حال کچھ ایسا ترے دیار میں ہے
کہ جیسے شہر کے رستے، اِک اجنبی کے لئے

فسردگی ہی مآلِ شگفتگی ہے مجیدؔ
کِسے خبر کہ ہنسی موت ہے کلی کے لئے

لوگ جب قوّتِ اظہار سے محروم ہوئے
خامشی سے بھی نمایاں کئی مفہوم ہوئے
ہم نے چھوڑے تھے محبّت کے جہاں نقش و نگار
وہ مقامات مٹانے سے نہ معدوم ہوئے
ہم کہ اِک لذّتِ پیہم ہے میسّر ہم کو
ہائے وہ لوگ ترے غم سے جو محروم ہوئے
میرے حصّے میں تو بس تشنہ لبی ہی آئی
میکدے صرف ترے نام سے موسوم ہوئے
دیکھنا! فصلِ بہاراں کی طلب کا فیضان
لوگ داماں و گریباں سے بھی محروم ہوئے
راز ایسے کہ جو کونین نے کھولے نہ کبھی
ہم کو اکثر تری آنکھوں ہی سے معلوم ہوئے
دِل پہ نشتر سا لگاتا ہے یہ احساس مجیدؔ
ظلم کیوں اتنے سہے ہم نے کہ مظلوم ہوئے

ہر خلش دِل کے لئے عید ہوئی جاتی ہے
تیرگی صبح کی تمہید ہوئی جاتی ہے

مَس ہوئی تھی جو مرے پیار بھرے ہونٹوں سے
وہ جبیں غیرتِ خورشید ہوئی جاتی ہے

کیا قیامت ہے محبّت سے اُٹھی تھی جو نظر
اَب مری ذات پہ تنقید ہوئی جاتی ہے

اِتنا یکساں ہے رُخِ گردشِ حالات کہ اَب
نااُمیدی مری اُمیّد ہوئی جاتی ہے

اَب حجابوں کے سِوا کچھ نظر آتا ہی نہیں
کتنی دُشوار تری دید ہوئی جاتی ہے

ہے سرِ بزمِ وَفا، تذکرۂ حُسنِ بیاں
میرے اِیمان کی تجدید ہوئی جاتی ہے

بے رُخی اُن کی، محبّت کی علامت ہے مجید
دِل کی دھڑکن سے بھی تائید ہوئی جاتی ہے

بات دِل کی نظر سے عیاں ہوگئی
بے زبانی ہی اپنی زباں ہوگئی

وہ نظر، دِل پہ جب مہرباں ہوگئی
ہر خلش بڑھ کے تسکینِ جاں ہوگئی

ہاتھ کِس کا مرے ہاتھ میں آگیا
تیز رفتارِ عمرِ رَواں ہوگئی

دستِ گلچیں کو اِحساس اس کا کہاں
بُوئے گُل کِس طرح رائیگاں ہوگئی

میری دُنیا بدل دی ترے ہجر نے
دِل میں جو روشنی تھی دُھواں ہوگئی

ہم گئے تھے کلی کی ہنسی دیکھنے
عارضِ گُل پہ شبنم گراں ہوگئی

کام آیا مجیدؔ اپنے دل کا لہو
ہر کلی رونقِ گُلستاں ہوگئی

بے کار گیا جذبۂ شوریدہ سری کیا
اے اہلِ قفس! شکوۂ بے بال و پری کیا

بیرونِ چمن، رازِ چمن لے کے گیا کون
اِس جرم سے اے موجِ صبا! تو ہے بَری کیا

رکھ اپنا قدم پھونک کے اے بادِ مخالف!
سمجھا ہے ہمیں تو نے چراغِ سَحَری کیا

جس شہر میں دل کی کوئی قیمت ہی نہ ٹھہرے
اس شہر میں یہ رسم و رہِ شیشہ گری کیا

ہر آن تجھے فکرِ کم و بیش ہے ساقی!
میخانے کے ماحول میں یہ کم نظری کیا

پروانے تو کھنچ آئے ہیں آپ اپنی ہی لَو میں
پھر شمع پہ یہ تہمتِ بیداد گری کیا

پھرتی ہے صبا، پھول سے خوشبو کی طلب گار
ہو گی نہ کبھی ختم یہ دریوزہ گری کیا

یاد ہوتی ہے تری، دیدۂ تر ہوتا ہے
شب کے آتے ہی ستاروں کا سفر ہوتا ہے

چوٹ آلام کی ہنستے ہوئے سہہ لیتے ہیں
کیا ترے چاہنے والوں کا جگر ہوتا ہے

کم نگاہی ہے اندھیرے کو اندھیرا کہنا
شب کے پردے میں بھی اِک حسنِ سحر ہوتا ہے

جب کسی برگِ خزاں دیدہ پہ پڑتی ہے نظر
جانے کیا بات ہے کیوں دِل پہ اثر ہوتا ہے

تم کہاں چھاؤں گھنی ڈھونڈ رہے ہو لوگو!
شجرِ عشق تو بے برگ و ثمر ہوتا ہے

سامنے سے وہ حریفانہ گزر جاتے ہیں
حادثہ یہ بھی سرِ راہ گزر ہوتا ہے

آشیاں ہم تو اُسی سمت بناتے ہیں مجیدؔ
رُخ زمانے کے حوادِث کا جدھر ہوتا ہے

موسوم ترے نام سے میخانے بہت ہیں
اے مست نگاہی ترے افسانے بہت ہیں

ہو گا نہ کبھی شمع کی محفل میں اندھیرا
ہم خاک بھی ہو جائیں تو پروانے بہت ہیں

اک حسنِ تبسّم میں ہیں سو رنگ غموں کے
دیکھو تو گلستاں میں بھی ویرانے بہت ہیں

ساقی! تری آنکھوں کا بھی مل جائے کوئی جام
طاقوں پہ تو رکھے ہوئے پیمانے بہت ہیں

آدابِ محبّت کا ہے کتنوں کو سلیقہ
کہنے کو تری بزم میں دیوانے بہت ہیں

اپنوں کی طرف جائیں تو کیا سوچ کے جائیں
اپنوں کی صفوں میں بھی تو بیگانے بہت ہیں

بیٹھے تو ہیں اک گوشۂ تنہائی میں لیکن
ہونٹوں پہ مجیدؔ آپ کے افسانے بہت ہیں

مانا کہ دیدہ زیب ہے گُل کی قبا کا رنگ
لیکن کچھ اور چیز ہے خونِ وفا کا رنگ
کتنی کہانیاں سرِ محفل بکھر گئیں
خاموشیوں سے پوچھئے میری صدا کا رنگ
اس رہگزر سے حُسنِ تعلّق تو دیکھئے
کتنا چمک اُٹھا ہے مرے نقشِ پا کا رنگ
ٹکرا کے مجھ سے وقت کے دھارے پلٹ گئے
دیکھا نہیں ہے آپ نے میری انا کا رنگ
مَیں بے زبانیٔ گُل و غُنچہ کو دیکھ کر
پہچاننے لگا ہوں چمن کی ہوا کا رنگ
لا کر ڈبو رہا ہے کنارے پہ کشتیاں
اب کے ہے کچھ عجیب مرے ناخدا کا رنگ

پوچھا کچھ اس ادا سے کسی نے مرا مزاج
آنکھوں میں آگیا، دِلِ دَرد آشنا کا رَنگ
سیرِ چمن سے اُنس مجھے کیوں نہ ہو مَجیدؔ
پھولوں میں دیکھتا ہوں کسی کی قبا کا رَنگ

دَرد، دِل سے اگر جُدا ہو جائے
زِندگی پھر تو اِک سزا ہو جائے

زِندگی قرض ہے محبّت کا
جس قدر جلد ہو اَدا ہو جائے

تم سمجھتے ہو بے وَفا دِل کو؟
اور سچ مچ جو بے وَفا ہو جائے

دِل کے اَوصاف ہر کسی میں نہیں
سنگ کس طرح آئینہ ہو جائے

ڈوب جاتا ہے لے کے ظالِم کو
ظلم حد سے اگر سوَا ہو جائے

دِل کو اِحساسِ اِرتقا ہی نہیں
ورنہ کم بخت کیا سے کیا ہو جائے

وہ مجھے زہر دے رہے ہیں مَجیدؔ
کیا عجب ہے۔ یہی دَوا ہو جائے

ڈریں کیا زندگی کے حادثوں سے
کہ یہ کم ہیں ہمارے حوصلوں سے

جو کانٹوں کو بھی شائستہ بنا دیں
چمن محروم ہے ایسے گلوں سے

چراغاں ہو رہا ہے فصلِ گل میں
نشیمن جل رہے ہیں بجلیوں سے

بتاتی ہے یہ میخانے کی ہلچل
ہوئی ہے کوئی لغزش مے کشوں سے

تری دریا دلی کا حال ساقی
سُنا ہے بارہا تشنہ لبوں سے

شریکِ دَور ہیں اب خود وہی لوگ
جنھیں نفرت تھی کل تک میکدوں سے

بکھر کر رہ گیا شیرازہ اپنا
مجیدؔ اپنوں کی چیرہ دستیوں سے

مرحلہ دید کا دُشوار نہیں ہے کوئی
عِشق کی راہ میں دیوار نہیں ہے کوئی

کِس قدر سَرد ہوا حوصلۂ سنگ زَنی
شیش محلوں پہ بھی یلغار نہیں ہے کوئی

دِل ہوے جو ہرِ احساسِ وَفا سے محروم
اب غمِ عِشق کا معیار نہیں ہے کوئی

لوگ بیٹھے ہیں اندھیروں کی تجارت کرنے
چاند سورج کا خریدار نہیں ہے کوئی

جانے کِس سَمت محبّت میں گئے دِیوانے
آج ہنگامہ سَر دار نہیں ہے کوئی

قافلے والے جدھر رُخ ہے چلے جاتے ہیں
جیسے اَب قافلہ سالار نہیں ہے کوئی

دُھوپ ہی دُھوپ میں پھروں تجھے چلنا ہے مَجید
دُور تک سایۂ دِیوار نہیں ہے کوئی

بھٹکتے پھرتے ہیں ہم آہِ نارسا کی طرح
جزا بھی تیری محبّت میں ہے سزا کی طرح

جبینِ شوق کو میری فریب دے نہ سکے
ہزار نقش ملے تیرے نقشِ پا کی طرح

نہ پوچھ کفرِ محبّت، ہم اہلِ ایماں کا
بتوں کے ناز اُٹھائے گئے خدا کی طرح

تمام عمر ہم اُس جانِ آرزو کے حضور
مِٹے مِٹے سے رہے حرفِ مدّعا کی طرح

عجب شعورِ جنوں ہے بہار میں اب کے
ہے چاک میرا جگر بھی مری قبا کی طرح

کھلی وہ زلف تو بھروں اِسی تصوّر میں
مرا خیال برستا رہا گھٹا کی طرح

مجیدؔ، اہلِ گلستاں کو بھی خبر نہ ہوئی
گزر گیا ہوں گلستاں سے میں صبا کی طرح

رُخِ بہار سے ہم فیضیاب ہو تو گئے
دلوں کے زخم گلوں کا جواب ہو تو گئے

مَیں زخم زخم ہُوا ، اس کا غم نہیں مجھ کو
بہت سے لوگ مگر بے نقاب ہو تو گئے

اَب اَور اِس کی نظر چاہتی ہے کیا ہم سے
کہ عمر بھر کے لئے ہم خراب ہو تو گئے

ہمارے دِل کا لہو کام آگیا آخر
چمن کے غنچہ و گُل فیضیاب ہو تو گئے

یہ اَور بات کہ ناکامِ روزگار رہے ہم
تری نظر میں مگر کامیاب ہو تو گئے

تِرا صحیفۂ رُخ اَپنے دِل پہ اُترا ہے
خدا کا شکر ، ہم اہلِ کتاب ہو تو گئے

مَجید تشنگیِ آرزو کے صدقے میں
ہم آشنائے فریبِ سراب ہو تو گئے

چلے ہیں جانبِ صحرا جو تیرے دیوانے
چمن کی طرح بکھرتے گئے ہیں ویرانے

لبوں پہ سب کے تو ہیں رنگ و بُو کے افسانے
گزر گئی جو گلوں پر وہ کوئی کیا جانے

نہ چاک چاک گریباں، نہ سنگ ہاتھوں میں
گزر رہے ہیں عجب منزلوں سے دیوانے

نہ جانے کب سے اُنھیں دیکھنے کا ارماں تھا
وہ رُو برو ہیں تو اب گُم ہیں آئینہ خانے

ہماری تشنہ لبی کا سلام لے ساقی!
بھرے رہیں مئے رنگیں سے تیرے پیمانے

اُداس پھول، کلی زرد، مضمحل غنچے
کوئی نہیں جو گلستاں کی نبض پہچانے

ہے سوزِ عشق سلامت اگر دلوں میں مجیدؔ
حضور شمع سلگتے رہیں گے پروانے

جب تک ہے تری دُھن میں سفر ہم کو گوارا
ہر سنگِ سرِ راہ گزر ہم کو گوارا

گزری ہے اگر رات تو سورج بھی نظر آئے
ہوتی نہیں مانگے کی سحر ہم کو گوارا

سچ کہنے پہ مصلوب کئے جائیں اگر لوگ
ایسے میں کہاں دوش پہ سر ہم کو گوارا

ہم آپ ہی مختار ہوں اپنی شبِ غم کے
وہ زلف رہے تا بہ کمر ہم کو گوارا

جس راہ سے منزل کا ہو دیدار میسّر
اُس راہ میں کانٹوں پہ سفر ہم کو گوارا

چہرے پہ خراشیں ہوں کہ ہو جائیں لہو ہاتھ
ہر حال میں ہے کارِ ہنر ہم کو گوارا

گزرے ہیں مجیدؔ آگ کے صحرا سے کئی بار
تب جا کے ہوا ہے کہیں گھر ہم کو گوارا

اشک کو سرمایۂ خونِ تمنا چاہیئے
ظرفِ ہر قطرہ میں اک امکانِ دریا چاہیئے

بڑھ کے ہم خود ہی الٹ دیں، یہ بساطِ کائنات
اُس نظر کا ایک مبہم سا اشارا چاہیئے

یا بقدرِ تابِ نظارہ ہو جلوے کی تڑپ
یا نظر، شائستۂ ذوقِ تماشا چاہیئے

ہیں صلیب و دار بھی، شمشیر بھی زنجیر بھی
سرفروشو! سرفروشی کا قرینا چاہیئے

سُرخروئی۔ یوں کہیں ہوتی ہے حاصل عشق میں
سُرخروئی کے لئے خونِ تمنا چاہیئے

رنگِ دُنیا سینکڑوں ہیں اور ہر اک رنگ میں
آدمی کو زندہ رہنے کا سلیقا چاہیئے

ہم میں ویرانی بھی ہے، ہم میں چمن بھی ہے مجید
اور کیا نیرنگیٔ ذوقِ تماشا چاہیئے

پُرسشِ غم میں تو اِک شانِ مسیحائی ہے
کس لئے پھر مرے زخموں کو ہنسی آئی ہے

ایسی مانوس مِرے نام سے رُسوائی ہے
جیسے کم بخت سے برسوں کی شناسائی ہے

آپ ناحق مجھے جینے کی دُعا دیتے ہیں
مَیں نے تو آپ پہ مرنے کی قسم کھائی ہے

دشمنوں سے تو مِرا ساتھ ہے اِک مدّت کا
دوستو! تم سے مِری کل کی شناسائی ہے

اب تو حالات کے اس موڑ پہ ہے چارہ گری
زخم دینا بھی جہاں کارِ مسیحائی ہے

ناز غیروں کے بھی ہنس ہنس کے اُٹھا سکتا ہُوں
مجھ میں اِتنی تو ابھی تابِ شکیبائی ہے

ہے عجب چیز یہ ناکردہ گُناہی بھی مجیدؔ
مَیں نے اس جُرم کی کیا کیا نہ سزا پائی ہے

دردہے دل کا جواں، فصل ہے زخموں کی ہری
چارہ گر! تجھ کو مبارک ہو تری چارہ گری

توڑ دو خود درِ زنداں کو اسیرو! بڑھ کر
ورنہ ہوگے نہ کبھی جرمِ اسیری سے بری

دور تک ہے کوئی سایہ، نہ مسافر، نہ شجر
دیکھیے دشتِ تمنا میں مری دربدری

کون خوش بخت، شبِ غم کی سحر دیکھے گا؟
کس کا منہ چومنے آئے گی نسیمِ سحری

ہم نے پھولوں سے سنا موسمِ گل میں اب کے
چاک در چاک رہا سلسلۂ جامہ دری

دیکھ لی میں نے شبِ غم کی سحر بھی اے دوست!
لوگ کہتے ہی رہے مجھ کو چراغِ سحری

اک تتمہ ہوں شبِ غم کے فسانے کا مجید
میں فروزاں ہوں مگر مثلِ چراغِ سحری

محفلِ دار میں ہنگامۂ سر باقی ہے
شکر ہے سلسلۂ فکر و نظر باقی ہے
رات کے بعد بھی رات آنے کا ڈر باقی ہے
کچھ سہی پھر بھی اِک امکانِ سحر باقی ہے
دل کہاں؛ دل کی جگہ اُس کی نظر باقی ہے
آئینہ ٹوٹ گیا، آئینہ گر باقی ہے
دِل کی دہلیز سے رُخصت ہوئیں یادیں کتنی
اِک تری نیم نگاہی کا اثر باقی ہے
راہبر ساتھ ہیں ایک ایک قدم پر لیکن
یہ تو بتلائے کوئی، کتنا سفر باقی ہے
دِل لہو ہم نے کیا ہاتھ لہو ہم نے کئے
پھر بھی اِک سلسلۂ کارِ ہنر باقی ہے
کس لئے حادثۂ وقت سے ڈرتے ہو مجید
سنگ آتے ہی رہیں گے جو یہ سر باقی ہے

رَوَا اُسے بھی رکھا آپ نے جہاں کے لئے
جو طرزِ خاص تھی مخصوص آسماں کے لئے
نمو کی فصل نے اَب کے بہ شکلِ غنچہ و گُل
ہزار زخم تراشے ہیں گلستاں کے لئے
مِلی خوشی جو مسلسل تو یہ کھُلا ہم پر
کہ غم تھا کتنا ضروری سکونِ جاں کے لئے
نہ جانے بھُول کے رستہ کِدھر نکل جائے
چراغ لاؤ کوئی میرِ کارواں کے لئے
گھروں کو چھوڑ کے چل تو دیئے ہیں اہلِ سفر
مگر خبر یہ کسی کو نہیں، کہاں کے لئے
وہ آپ مرکزِ حُسنِ خیال ہے یارو!
ہے اپنا ذکر فقط زیبِ داستاں کے لئے
مجیدؔ ہم کو نہیں دعوئے زباں لیکن
دیا ہے ہم نے بھی اپنا لہُو زباں کے لئے

جام چھلکائیں، صراحی سے نظر چار کریں
میکدہ نیند میں ہے ہم اسے بیدار کریں
رنگ اپنا کوئی قائم سرِ گلزار کریں
آؤ! کانٹوں سے بھی پھولوں کی طرح پیار کریں
کون آئے گا شبِ غم مری پرسش کیلئے؟
آپ آئیں گے؟ ذرا سوچ کے اقرار کریں
ایک قاتل بھی ہے اس شہر میں منصف کی طرح
جان کی ہم جو اماں پائیں تو اظہار کریں
غنچہ و گل پہ کوئی تازہ قیامت ٹوٹے
لوگ اتنا بھی نہ ذکرِ لب و رخسار کریں
ظلمتِ شب سے بہر حال گزرنا ہو گا
لاکھ ہم شامِ الم کو سحر آثار کریں
آپ کو سیکڑوں سائے نظر آئیں گے مجید
رُخ ذرا اپنی نظر کا پسِ دیوار کریں

جگر خوں ہے مگر لب پر ہنسی ہے
کلی کی زندگی، کیا زندگی ہے

امیدوں ہی پہ دنیا جی رہی ہے
حسین کتنا فریبِ زندگی ہے

محبت نے بہاروں کی کہانی
لہو کی روشنائی سے لکھی ہے

فروزاں ہی سہی آنکھوں کی شمعیں
دلوں میں پھر بھی کتنی تیرگی ہے

جہاں تک چل رہا ہے دورِ ساغر
وہیں تک میکدے میں روشنی ہے

ہنر تو دیکھ دستِ چارہ گر کا
ابھی تک فصل زخموں کی ہری ہے

مجیدؔ اہلِ وفا کے تذکرے پر
تری آنکھوں میں یہ کیسی نمی ہے

دِل کی دُنیا کا بدلنے کو نظام آتے ہیں
مژدہ لے اہلِ نظر! وہ سرِ بام آتے ہیں

قصدِ توبہ پہ گزر جاتے ہیں عالم کیا کیا
اُس نظر کے جو چھلکتے ہوئے جام آتے ہیں

آدمی موت کو ٹھکرا کے گزر جاتا ہے
دل کی راہوں میں کئی ایسے مقام آتے ہیں

روند کر راہ کے کانٹوں کو جو آگے بڑھ جائیے
ہر قدم پر اُسے منزل کے سلام آتے ہیں

آپ دیکھیں تو کبھی راہزنوں کی تاریخ
اسمیں کچھ راہنماؤں کے بھی نام آتے ہیں

کھائیے سنگِ ملامت کی توقع کس سے
ایسے موقع پہ تو احباب ہی کام آتے ہیں

ہم کو فرصت ہی کہاں آنکھ اُٹھانے کی مجیدؔ
ان نگاہوں کے تو ہر [illegible] سلام آتے ہیں

جہاں رہیں نغمہ بہ لب ہر طرف ہزاروں ساز
سُنی گئی ہے وہاں بھی سکوت کی آواز
اسی کا نام ہے شاید شکستِ قیدِ ذہن
ہر ایک ذہن پہ طاری ہے عالمِ پرواز
سوال یہ ہے کہ جاں سے گزر گئے کیوں لوگ
جواب یہ ہے کہ قاتل کی زندگی ہو دراز
کلام کیا ہے؟ اداۓ شکستِ خاموشی
سکوت کیا ہے؟ مری گفتگو کا اِک انداز
مرے بھی دشتِ تمنّا میں کوئی پھول کھلے
اُٹھا رہا ہوں اِس اُمّید پر بہار کے ناز
جہاں سے درد کا سورج طلوع ہو جائے
اُسی مقام سے ہوتا ہے صبح کا آغاز
یہ دِل اسی کے اِشاروں پہ چل رہا ہے مجیدؔ
نگاہِ دوست کو کیسے کہیں غلط انداز

ترے جمال سے عالم ہو گیا، خدا جانے
ترے خیال سے حیراں ہیں آئینہ خانے
مری نظر میں تو مقتل ہیں ایسے میخانے
کہ آدمی نہ جہاں آدمی کو پہچانے
ہمیں قبول ہے بیگانگی بھی اپنوں کی
مگر وہ لوگ، جو اپنے رہے نہ بیگانے
کسی میں رنگِ تعلّق، کسی میں رنگِ گریز
ہر اک نگاہ کے یکساں نہیں ہے پیمانے
عجب ہے سوزِ تعلّق کی انجمن کا مزاج
یہاں تو شمع سے پہلے جلے ہیں پروانے
ہم اپنے آپ سے بھی آشنا نہیں ہیں مجیدؔ
کوئی ہماری "انا" کا مزاج کیا جانے

سَو جگہ سے گرچہ دَامن چاک ہے
پھر بھی دِیوانہ بڑا بیباک ہے

ساتھ اَپنے لے گئی رَازِ چمن
نکہتِ گُل کِس قدر چالاک ہے

کچھ سِتَم پَر ہی نہیں ہے منحصر
وہ کرم میں بھی بڑا سَفّاک ہے

حاصِلِ مقصد ہے منزل کا سُراغ
جستجو تو رَاستے کی خَاک ہے

آدمی جب سے زمیں پَر بَس گیا
کِتنا سَنّاٹا سَرِ اَفلاک ہے

خندۂ گُل پر نہ جا اَے باغباں
دیدۂ نرگس اَبھی نمناک ہے

قامتِ دُنیا پہ جب دیکھو مُجیدؔ
اِک نئے اَنداز کی پوشاک ہے

بیداریاں نہ ڈھونڈھیئے خوابوں کے درمیاں
دریا کہاں ملیں گے سرابوں کے درمیاں

فطرت نے جلوۂ رُخ و عارض کے رُوپ میں
آئینہ رکھ دیا ہے حجابوں کے درمیاں

پھولوں پہ ہے نظر، یہ کسی کو خبر نہیں
دل بھی دھڑک رہے ہیں گلابوں کے درمیاں

کیسے سمجھ میں آئیں گے چہرے حروف کے
بینائی سو گئی ہے کتابوں کے درمیاں

طوفانِ درد، خونِ وفا، زخمِ آرزو
اک دل ہے اور کتنے عذابوں کے درمیاں

دیوانگئ اہلِ خرد، کچھ نہ پوچھیئے
تعبیر ڈھونڈھتے ہیں یہ خوابوں کے درمیاں

گھر پر کہاں مجید کو آئے ہو ڈھونڈھنے
وہ تو ملے گا خانہ خرابوں کے درمیاں

کیا دھوپ میں، کیا سایۂ دیوار میں رہنا
رہنا ہی جو ٹھہرا، نگرِ یار میں رہنا
گھر چھوڑ کے بھی، گھر ہی کے آزار میں رہنا
کھوئے ہوئے فکرِ در و دیوار میں رہنا
سو بار نگاہوں سے گزر جائے وہ چہرہ
آنکھوں کو مگر حسرتِ دیدار میں رہنا
کچھ اور بڑھا دیتا ہے معنیٰ کا تاثّر
چپ رہ کے بھی پیرایۂ اظہار میں رہنا
جو مصلحتِ وقت کو خاطر میں نہ لائے
وہ حسن "انا" چاہیئے فن کار میں رہنا
رندوں کو نہ کر دے کہیں میخانے سے بیزار
گردش کا فقط ایک ہی رفتار میں رہنا
ہم کو تو مجیبؔ اک نگہِ لطف کے بدلے
بہروں کسی اندیشۂ آزار میں رہنا

جگر فِگار رَہے، پیرَہن دریدہ رَہے
یہ کم نہیں ہے کہ ہم پھر بھی سرکشیدہ رَہے

بچھڑ کے شاخ سے پھولوں پہ کیا گذرتی ہے
یہ سوچ سوچ کے پہروں ہم آبدیدہ رَہے

ضمیرِ عشق کی آواز تھے وُہی نغمے
سماعتوں کی حدوں میں جو ناشُنیدہ رَہے

مقامِ تَرکِ تمنّا ہے کیا محبّت میں
وہ کیا بتائیں گے جو آرزو گزیدہ رَہے

مَیں بھُول جاؤں خود اپنے وجود کو لیکن
مِرے لبوں پہ تِرے نام کا قصیدہ رَہے

نظر سے حشر اُٹھایا، نہ کچھ زباں سے کہا
عجیب رنگ میں تیرے ستم رسیدہ رَہے

وَفا کا ذکر کوئی جرم تو نہیں تھا مجیبؔ
نہ جانے ہم سے وہ کس بات پر کشیدہ رَہے

نہ رہا غم بھی اگر، کیا ہوگا؟
بول اے دیدۂ تر! کیا ہوگا؟

ہر طرف پھیلتا جاتا ہے غبار
ایسے موسم میں سفر کیا ہوگا؟

دل ہے بے کارِ محبّت کے بغیر
نہیں سایہ تو شجر، کیا ہوگا،

دیر تک ہم نے اُنھیں دیکھا ہے
اور معیارِ نظر کیا ہوگا،

جس میں رہنے کی بھی فرصت نہ ملے
کوئی بتلائے کہ وہ گھر کیا ہوگا،

ہجر کی شب کو غنیمت سمجھو
کیا خبر، وقتِ سحر کیا ہوگا،

اُس سے ملنے کو چلے تو ہو مجید
اُس سے مل کر بھی مگر کیا ہوگا،

رنگ بھرتا گیا غم، عشق کے افسانے میں
زندگی پھول کھلاتی گئی ویرانے میں

کتنے آسودۂ حالات تھے میخانے میں
جانے کیوں آ گئے ہم وقت کے بہکانے میں

کروٹیں، زیست بدلتی ہے ہر اک سانس کیساتھ
لطف کتنا ہے ترے نام کے دہرانے میں

رنگِ تعمیرِ جنوں دیکھئے دیوانوں کا
شہر کے شہر بسا رکھے ہیں ویرانے میں

مے ہے آنکھوں میں کہ عرفانِ حقیقت ساقی!
جامِ جم دیکھ رہا ہوں ترے پیمانے میں

کم نہیں یہ بھی کرشمہ کہ مرے دل کا لہو
بن گیا بادۂ گلگوں ترے پیمانے میں

لوگ یوں نشۂ دولت میں بہک جاتے ہیں
جیسے پیمانے چھلک جاتے ہیں میخانے میں

حق ترے غم کا، کچھ اِس طرح اَدا ہو جائے
آہ بھی آئے لبوں پر تو دُعا ہو جائے

دیکھ کر جس کو نقابوں میں بھی خیرہ ہے نظر
وہ اگر سامنے آجائے تو کیا ہو جائے

مجھ کو ڈر ہے کہ تری حشر خرامی کے طفیل
وقت سے پہلے قیامت نہ بپا ہو جائے

اَپنے چہرے پہ نگاہیں نہیں اُٹھتیں اس کی
مَیں جو آئینہ دِکھاؤں تو خَفا ہو جائے

آ کے بَس جائے جو اُس بُت کی محبّت دِل میں
دِل مِرا قبلۂ اَربابِ وَفا ہو جائے

مقصدِ عشق، فراموش نہ ہو جائے کہیں
آپ کا لُطف اگر حد سے سِوا ہو جائے

ہم کو معلوم ہے فرعون کا انجام مَجیدؔ
کوئی چاہے تو بصد شوق خُدا ہو جائے

متاعِ فصلِ بہاراں، سنبھال کر رکھو
تم اپنا چاکِ گریباں، سنبھال کر رکھو

جہانِ عشق کی عظمت اسی میں مضمر ہے
تقدّسِ غمِ جاناں، سنبھال کر رکھو

خیالِ خاطرِ رہزن بھی چاہیئے تم کو
مسافرو سر و ساماں، سنبھال کر رکھو

پڑے گا صبحِ وطن سے بھی واسطہ اسکو
حدیثِ شامِ غریباں، سنبھال کر رکھو

انہی کے دم سے دلوں میں کھِلے ہوئے ہیں چمن
خیالِ روئے نگاراں، سنبھال کر رکھو

کمال یہ ہے کہ شہرِ بتاں میں رہ کر بھی
تم اپنا کعبۂ ایماں، سنبھال کر رکھو

گُلوں کو لوٹ کے ارشادِ باغباں ہے مجید
کہ آبروئے گلستاں، سنبھال کر رکھو

درِ غریب کسی کے لئے بھی بند نہیں
امیرِ شہر کو شاید یہی پسند نہیں

حِصارِ ذات سے نِکلا تو یہ ہُوا معلوم
کہ پستیوں سے مری آسماں بلند نہیں

تمام عمر ترا غم شریکِ حال رہا
میں کیوں کہوں کہ مرا کوئی دردمند نہیں

ہمیں خیال ہے ناموسِ غنچہ و گُل کا
چمن کو ورنہ صبا سے کوئی گزند نہیں

مجھے خلوصِ وفا پر یقین ہے ورنہ
یہ زہرِ عشق ہے، میں جانتا ہوں قند نہیں

چھُپائے رکھتے ہیں خنجر جو آستینوں میں
ہمارے شہر میں ایسے بہت ہیں چند نہیں

مجیدؔ کُنجِ قفس میں سکوں بہت ہے مگر
میں کیا کروں کہ طبیعت سکوں پسند نہیں

کب مجھے آپ کا خیال نہیں
کب مرا حال حسبِ حال نہیں
آپ ہی کی خوشی ہے مدِّنظر
اپنے غم کا مجھے ملال نہیں
ایک پیغام ہوں محبّت کا
میں ہوں زندہ مجھے زوال نہیں
صرف مدِّنظر ہے حکم ترا
میرے پیشِ نظر مآل نہیں
ناخدا تم جو ہو سفینے کے
ڈوبنے کا مجھے ملال نہیں
زندہ رہنے کی بات کر واعظ!
آخرت کا ابھی سوال نہیں
عزمِ انساں پہ منحصر ہے مجید
مرحلے عشق کے محال نہیں

ہم نے صحرا کو بھی دریا دیکھا
تشنگی! تیرا کرشما دیکھا

جب بھی آئینے میں دیکھا خود کو
عکس تیرا ہی جھلکتا دیکھا

ایک دنیا تھی جلو میں میرے
اور سب نے مجھے تنہا دیکھا

فصلِ گُل، رنگِ خزاں، زخمِ بہار
زندگی نے جو دکھایا، دیکھا

غنچہ و گُل کے پرستاروں کو
ہم نے کانٹوں سے اُلجھتا دیکھا

چند محلوں کی حفاظت کے لئے
شہر کا شہر اُجڑتا دیکھا

کوئی اُفتادِ زمانہ ہو مجید
تم کو ہر حال میں ہنستا دیکھا

خونِ دِل، رنگِ حِنا کچھ بھی نہیں
زندگی میں اَب مزا کچھ بھی نہیں

اِعترافِ دشمنی ہی کیجیئے
کیا محبّت کا صِلا کچھ بھی نہیں؟

مجھ سے خود جُرمِ وَفا سرزد ہُوا
دوستو! تم سے گِلا کچھ بھی نہیں

سوچیئے تو اِک صدی ہے ایک پَل
دیکھئے تو فاصلہ کچھ بھی نہیں

خود ہماری ذات ہی دیوار ہے
یہ گِرے تو راستہ کچھ بھی نہیں

کھیلتے رَہتے ہیں جو طوفان سے
اُن کو سیلابِ بلا کچھ بھی نہیں

میَں سمجھتا ہوں قیامت کو مَجیدؔ
صبحِ فُرقت کے سِوا کچھ بھی نہیں

یہ الگ بات ہے، سنور نہ سکے
حادثوں سے بھی ہم بکھر نہ سکے

ہم نے صدیاں وہاں گزاری ہیں
لوگ اِک پل جہاں ٹھہر نہ سکے

بارِ خاطر رہے ہیں وہ لمحات
جو تری یاد میں سے گزر نہ سکے

اُن کو حیرت سے دیکھتا ہوں مَیں
جو ترے نام پہ بھی مر نہ سکے

حال کیا کہیے، تہہ نشینوں کا
ایسے ڈوبے کہ پھر اُبھر نہ سکے

ایک حسرت سی رہ گئی دِل میں
اپنی دُنیا کی سیر کر نہ سکے

بُوالہوس تھے جو میکدے میں مجیدؔ
اپنا پیمانہ آپ بھر نہ سکے

ہر شئے تہہ و بالا ہے، ہر چیز پریشاں ہے
شاید کہ زمیں اپنے محور سے گریزاں ہے

ہر سمت دھندلکا سا چھایا ہے فضاؤں پر
یہ صبح بہاراں ہے یا شامِ غریباں ہے

بے موسمِ گل، تیرا یہ ذوقِ چمن بندی
فطرت کا تمسخر ہے، توہین بہاراں ہے

محدودِ گلستاں ہو کیوں حسنِ نظر اپنا
ہر خار گلِ تر ہے، ہر ذرّہ بیاباں ہے

ہم نے تو سمیٹا ہے یہ سوچ کے ہر غم کو
آئینِ محبّت میں ہر غم، غمِ جاناں ہے

اربابِ خرد ہم سے اُلجھیں بھی تو کیوں اُلجھیں
ہے دستِ جنوں اپنا، اپنا ہی گریباں ہے

بیٹھے ہیں مجیدؔ آخر کس سوچ میں دل والے
اب جنسِ محبّت تو ہر شہر میں ارزاں ہے

سکوت، آمدِ طوفاں کا پیش خیما تھا
یہ ناخدائے سفینہ کو خود سمجھنا تھا
اسی نگاہ نے اِحساس کو جھنجھوڑا تھا
جسے میں وقت کا اِک حادثہ ہی سمجھا تھا
اک ایسا وقت گلستاں میں مجھ پہ آیا تھا
کہ میں گلوں سے بھی دامن بچا کے چلتا تھا
عجیب وقت تھا وہ بھی "انا" پرستوں پر
ہر ایک ہاتھ میں آئینہ میں نے دیکھا تھا
بہت گراں رہا صدیوں کے زُہد و تقویٰ پر
وہ ایک لمحہ جو رِندوں کے ساتھ گزرا تھا
یہ اور بات کہ تجھ تک صدا نہیں پہنچی
ہر ایک موڑ پہ میں نے تجھے پکارا تھا
گزر گئی ہو نہ جانے خزاں میں کیا اُن پر
بہار میں بھی جنھیں دِل فِگار دیکھا تھا

ایک بھی تار سلامت نہ گریباں میں رہے
گھر جب ایسا ہے تو پھر کون بیاباں میں رہے

یہ اگر موسمِ گل ہے تو بتا اے گلچیں!
پھول کیوں سہمے ہوئے صحنِ گلستاں میں رہے؟

منزلِ دار سے کتنے ہی سلام آئے ہمیں
ایک لمحے کو اگر کوئے نگاراں میں رہے

جب چھٹا مجمعِ احباب تو معلوم ہوا
ہاتھ کس کس کے مرے چاک گریباں میں رہے

کیا قیامت ہے کہ گلشن میں اُدھر آگ لگی
لوگ مصروف اِدھر جشنِ چراغاں میں رہے

کیا خبر بوالہوسوں کو کہ تری دید کے بعد
کتنے آئینے مرے دیدۂ حیراں میں رہے

لے گئے سیکڑوں گل توڑ کے گلشن سے مجیدؔ
لوگ پھر بھی گلۂ تنگیٔ داماں میں رہے

ایسا بھی کوئی مانی و ارژنگ نہ دیکھا
اِس آئینہ صورت پہ جسے دَنگ نہ دیکھا

بنوا تو لیا شیش محل آپ نے لیکن
ہاتھوں میں زمانے کے کوئی سنگ نہ دیکھا

الفاظ و معانی تو ہیں درکار خرد کو
دیوانے کو شرمندۂ فرہنگ نہ دیکھا

رہتا ہے گریزاں ہی اُجالے سے اندھیرا
باطل کو کبھی حق سے ہم آہنگ نہ دیکھا

رہتا ہے گریباں ہی سدا دستِ جنوں میں
دیوانے گئے ہاتھوں میں کبھی چنگ نہ دیکھا

اُس شوخ کا اندازِ تغافل تھا عجب چیز
اشکوں میں بھی عکسِ دلِ گلرنگ نہ دیکھا

جو تیغ لٹکتی رہی آشفتہ سروں پر
اُس تیغ کو سرگرم، سرِ جنگ نہ دیکھا

برنگِ گُل، مرا سینہ فگار تو ہوگا
چمن کے نام پہ جشنِ بہار تو ہوگا

ہمارا نام کہ اب تک زبانِ خلق پہ ہے
تمہارے ذوقِ سماعت پہ بار تو ہوگا

نگاہِ شوق کی بے تابیوں سے ظاہر ہے
حجابِ حسن سے تو آشکار تو ہوگا

اَدائے جبر کو کب تک رکھو گے پردے میں
ستم ستم ہے کبھی آشکار تو ہوگا

خلوصِ دل پہ ہو کتنا ہی شک زمانے کو
اِس آئینے کا تجھے اعتبار تو ہوگا

ہزار جشن منائیں وہ میرے بعد مگر
زمانہ میرے لئے سوگوار تو ہوگا

شبِ فراق کی تاریک خلوتوں میں مجید
اسے بھی میری طرح انتظار تو ہوگا

سکوتِ غنچہ و گل کو جواب کیا دیتا
چمن ہے خواب تو تعبیرِ خواب کیا دیتا

جمالِ حسن کا پرتو ہے خود ہی آئینہ
جمالِ حسن کو آئینہ، آب کیا دیتا

سکون مجھ کو جہانِ خراب کیا دیتا
بجز فریبِ نظر یہ سراب کیا دیتا

مزاجِ عشق ہے عجز و نیاز کا پیکر
غرورِ حسن کا تیرے جواب کیا دیتا

اُسی کے رُخ کا تصوّر اُسی کی زُلف کا دِھیان
مَیں اپنی شام و سَحر کا حساب کیا دیتا

اَدا شناس ہوں واعِظ کی پاکبازی کا
مجھے وہ دَرسِ عذاب و ثواب کیا دیتا

شکستِ شیشۂ دِل کی صدا ہی کافی تھی
مجیدؔ نغمۂ چنگ و رُباب کیا دیتا

مِلا نہ پھر بھی اگر مُدّعا تو کیا ہو گا
اُٹھے رہے یوں ہی دستِ دعا تو کیا ہو گا

خود اپنے ہاتھ سے وہ زہر دے رہے ہیں مجھے
جو ہو گیا یہی آبِ بقا تو کیا ہو گا

اسی کے دم سے ہے روشن یہ کائناتِ وجود
چراغ دِل کا اگر بجھ گیا تو کیا ہو گا

تری خوشی ہی بہر حال ہے مرا مقصد
زمانہ ہو گیا مجھ سے خفا تو کیا ہو گا

جہاں کے لوگ ہی مُردہ ضمیر ہیں تو انھیں
جگائیں کتنے ہی کرب و بلا تو کیا ہو گا

بچھڑ کے آپ سے مرنا تو کوئی بات نہیں
خدا نخواستہ جینا پڑا تو کیا ہو گا

یہ سوچ سوچ کے اکثر لرز گیا ہوں مجیدؔ
کہ درد ہو گیا دِل سے جدا تو کیا ہو گا

ہم سے وہ ہم کلام ہے
رشک کا یہ مقام ہے
حسن کے دل سے پوچھیئے
عشق کا کیا مقام ہے
منزلِ جاں کا فاصلہ
زحمتِ چند گام ہے
تم ہو حریمِ ناز میں
ذکر تمہارا عام ہے
رقصِ نظامِ کائنات
آپ کا اک خرام ہے
وہ ہے امینِ روشنی
ہاتھ میں جس کے جام ہے
صرفِ چمن ہوئے جو پھول
ان کو مرا سلام ہے

واعظ ہے کتنا تنگ نظر، سوچتا ہے اَور
عشقِ بُتاں سے ورنہ مرا مدّعا ہے اَور

ممکن ہے بزمِ غیر میں میرا ہی ذِکر ہو
لیکن زبانِ خُلق سے مَیں نے سُنا ہے اَور

اِک عالمِ وصال ہے، اِک عالمِ فِراق
آوازِ ساز اَور ہے دِل کی صَدا ہے اَور

ہر لمحہ دے رہا ہے حساب اَپنے وَقت کا
واعظ کو یہ گماں ہے کہ رُوزِ جزا ہے اَور

تڑپا رہا ہے ماہئ بے آب کی طرح
اس کی نگاہِ ناز میں دل کی سزا ہے اَور

عیشِ دوام ہوگا کِسی کے لئے علاج
مَیں تو مریضِ عشق ہوں میری دَوَا ہے اَور

عُمرِ دَراز مانگ کے کیا مِل گیا مجید
اُن کی طلب ہے اَور، تِرا مدّعا ہے اَور

حُسن کی سادگی پہ مَرتا ہوں
صِرف اِتنا گناہ کرتا ہوں

مَیں شناوَر ہوں بحرِ ہستی کا
ڈوب جاتا ہوں پھر اُبھرتا ہوں

فیض جاری ہے موسمِ گل کا
زخم کِھلتے ہیں، مَیں نکھرتا ہوں

جانے آجائے کب تِری آواز
دِل کی دَھڑکن پہ کان دَھرتا ہوں

کیوں اُٹھاؤں مَیں غیر کا اِحساں
اَپنا پیمانہ آپ بَھرتا ہوں

دوستوں کے ہیں زَرد کیوں چہرے
مَیں تو دشمن کا ذِکر کرتا ہوں

خود مجھے بھی خبر نہیں ہے مَجید
کِن اِشاروں پہ رَقص کرتا ہوں

بہر نگاہ نظر آئیں صورتیں کیا کیا
خیال و فکر پہ گذریں قیامتیں کیا کیا
خرامِ موجِ صبا سے گلوں کی خوشبو تک
گراں ہوئی ہیں چمن پر لطافتیں کیا کیا
بنا کے آئینہ مجھ کو جمالِ فطرت نے
بکھیر دی ہیں زمانے میں حیرتیں کیا کیا
عذابِ دربدری، داغِ ہجر، زخمِ وفا
ملی ہیں ہم کو محبّت میں نعمتیں کیا کیا
کسے خبر کہ تری اِک نگاہِ سادہ سے
گزر گئی ہیں دلوں پر قیامتیں کیا کیا
مَیں دستِ آزرِ فطرت کو چوم لیتا ہوں
کہ پتّھروں سے تراشی ہیں صورتیں کیا کیا
حرم میں بیٹھ کے دعوے کئے خدائی کے
عطا ہوئی تھیں بتوں کو بھی جرأتیں کیا کیا

راس آئیں اگر نہ ویرانے
پھر کہاں جائیں تیرے دیوانے
یہ اَلمیہ ہے مے گُساروں کا
سُونے سُونے پڑے ہیں میخانے
کتنا پاسِ "اَنا" ہے رِندوں کو
آپ بھرتے ہیں اَپنے پیمانے
شہر کے شہر کروٹیں لیں گے
دَشت کا رُخ کریں تو دِیوانے
جس نے کھایا نہیں ہے زَخمِ وَفا
پھول کے رنگ کو وہ کیا جانے
کتنے روشن ضمیر ہوتے ہیں
شمع کے جاں نِثار پَروانے
وہ بہ ظاہر تو مہرباں ہے مَجِید
دِل میں کیا ہے یہ کوئی کیا جانے

سب کو باتیں وہی کھٹکتی ہیں
جن سے سچّائیاں ٹپکتی ہیں

بَن کے خوشبو تمہاری گلیوں میں
میری رُسوائیاں مہکتی ہیں

گل کی شاخوں کا کیا بھروسہ ہے
تیغ بَن کر بھی یہ لچکتی ہیں

دِل تو کہتا ہے، وقت کی نبضیں
تیری رَفتار سے دھڑکتی ہیں

دِیدنی ہے مآل موجوں کا
آ کے ساحل پہ سَر پٹکتی ہیں

زیرِ سایہ ہی شیش محلوں کے
کتنی رُوحیں ہیں جو سِسکتی ہیں

سُوچتا ہوں مَجیدؔ گلشن میں
کیوں نِگاہیں مِری بھٹکتی ہیں

وہ مجھے دھوپ کے صحرا سے گزرنے بھی نہ دے
اپنی دیوار کے سائے میں ٹھہرنے بھی نہ دے

وہ عجب شخص ہے پہلو میں سمٹتا بھی نہیں
میں اگر چاہوں بکھرنا تو بکھرنے بھی نہ دے

کیا ستم ہے کہ کرے، فصلِ بہاراں کا گلہ
وہ جو غنچوں کو گلستاں میں نکھرنے بھی نہ دے

خندۂ زخم گوارا ہی نہیں تجھ کو اگر
نشترِ غم کو مرے دل میں اترنے بھی نہ دے

وہ کوئی پاسِ تعلّق بھی نہ رکھے لیکن
منزلِ ترکِ مراسم سے گزرنے بھی نہ دے

چھین لے شانۂ تزئینِ ہنر بھی مجھ سے
زلفِ افکارِ پریشاں کو سنوّرنے بھی نہ دے

چارہ گر کا ہے بہت خوب یہ انداز مجیدؔ
دل پہ مرہم بھی رکھے، زخم کو بھرنے بھی نہ دے

جب ہوں گے اہلِ عشق، نمودار دیکھنا
پھر سُرخیاں لہو کی سرِ دار دیکھنا

تابِ ادائے حُسنِ طرح دار دیکھنا
آئینہ خود ہے آئینہ بردار دیکھنا

کتنی ہی بے گناہی کی دیتے رہیں دلیل
ٹھہریں گے پھر بھی ہم ہی گنہگار دیکھنا

اِک جنبشِ نگاہ میں تھا فیصلہ مرا
یہ کیا کہ مجھ کو دیکھ کے تلوار دیکھنا

ہے حوصلہ تو پھر درِ زنداں کو توڑ دو
توہین ہے نوشتۂ دیوار دیکھنا

اب سیم و زر سے ناپتے ہیں قامتِ نسب
تہذیبِ عصرِ نو کا یہ معیار دیکھنا

دھوکا نہ کھانا سایۂ دیوار سے مجید
دیوار دیکھنا پسِ دیوار دیکھنا

نہ دُو زحمت ابھی سے چارہ گر کو
ذرا بھرنے تو دو زخمِ جگر کو

حیا دیوار بَن جاتی ہے اکثر
مَیں جب بھی دیکھتا ہوں اُس نظر کو

چُھپا لیتے ہیں دِل کے زخم لیکن
چُھپائیں کِس طرح ہم زخمِ سَر کو

شبِ غم کے درخشندہ ستارو!
بتاؤ! تم کہاں ہو گے سَحر کو

مجھے تو اِن چراغوں ہی سے ڈر ہے
جَلا ڈالیں نہ اِک دِن اَپنے گھر کو

اُٹھاؤں گا حِجابِ زُلف و رُخ بھی
سمجھ تو لُوں ذرا شام و سَحر کو

اَدب مانع ہے ورنہ سوچتا ہوں
دِکھا دُوں آئینہ، آئینہ گر کو

مُسلسل بارشِ سنگِ مَلامت
کہاں تک ہم بچائیں اَپنے سَر کو
چلو حالات سے سمجھوتہ کرلیں.
بَنائے کون دُشمن شہر بَھر کو
غزل کا حُسن نِکھرا جا رَہا ہے
دُعا دو صاحبِ "زخمِ ہنر"[1] کو

---

[1] مجموعۂ کلام حضرت شاعر لکھنوی

فصلِ گُل آئے گی، گلشن بھی مہک جائے گا
ہاں مگر شیشۂ دِل اور دَرک جائے گا

تہمتِ چاک سِلا گریباں کو بھی تک رکھّو
سلسلہ ورنہ بہت دُور تلک جائے گا

رقص تو ایک تقاضا تھا بلا نوشی کا
کس کو معلوم تھا پیمانہ چھلک جائے گا

چھیڑ کر دیکھیئے، خاکسترِ پَروانۂ دِل
ایک شعلہ سا سَرِ بزم لپک جائے گا

بیکرانیٔ غمِ عشق نہ پوچھو یارو!
دِل تو پھر دِل ہے سمندر بھی چھلک جائے گا

نکہت و رَنگ چھُپائے سے کہیں چھُپتے ہیں
جب بَہار آئے گی ہر زَخم مہک جائے گا

آپ تشریف اگر لائیں، عنایت ہو گی
گھر مِرا آپکی خوشبو سے مہک جائے گا

مشعلِ عزمِ مسلسل کو فروزاں رکھو
قافلہ ورنہ اندھیروں میں بھٹک جائے گا
ہے یہی شدّتِ احساس کا عالم تو مجید
اشک بن بن کے لہو دِل کا ٹپک جائے گا

آتشِ عشق میں رقصندہ ہوں

مثلِ خورشید میں تابندہ ہوں

مجھ کو گہنا نہ سکے گرد و غبار

ذرّے ذرّے سے درخشندہ ہوں

عجز ہی جوہرِ فطرت ہے مرا

یوں تو یزداں کا نمائندہ ہوں

میں ادا کر نہ سکا قرضِ حیات

ذات کے بوجھ سے شرمندہ ہوں

زندگی کے لئے مرتے ہیں لوگ

میں تو مرنے کے لئے زندہ ہوں

اجنبی کہہ کے نہ شرمندہ کر

میں ترے شہر کا باشندہ ہوں

ہاں کرو، شوق سے مصلوب کرو

میں محبت کا نمائندہ ہوں

زندگی کب کی مجھے چھوڑ گئی
لوگ کہتے ہیں کہ مَیں زِندہ ہوں
ہے نیابت تو بڑی بات مَجیبؔ
کب مَیں اپنا بھی نمائِندہ ہوں

Scanned by CamScanner

حادثوں نے جن کو بخشی فطرتِ مشکل پسند
آ نہیں سکتی اُنھیں آسائشِ منزل پسند

مختلف ہے کس قدر دونوں کا اندازِ نظر
ہم کو طوفاں سے محبّت، آپکو ساحل پسند

اِس طرف ہم جاں ہتھیلی پر لئے ہیں منتظر
اُسطرف اِک دشمنِ جاں کو ہمارا دِل پسند

تیغ کی جُنبش سے جو کارِ مسیحائی کرے
لوگ چاہیں کچھ کہیں، ہمکو ہی وہ قاتل پسند

آج تک بحرِ حوادِث کی جبیں ہے پُر شکن
ایک دِن آیا تھا ہم کو منظرِ ساحل پسند

خشک آنکھیں ہیں، مژہ پر ایک آنسو بھی نہیں
آگیا ہے ہم کو اپنے درد کا حاصل پسند

امتیازِ رنگ و بُو کے ہم نہیں قائل مجید
کوئی صورت ہو ہمیں ہے جوہرِ قابل پسند

سر سے طوفاں گزر گیا ہوتا
میں جو موجوں سے ڈر گیا ہوتا
کچھ تو احساں وہ کر گیا ہوتا
دل نہ بھاتا تو سر گیا ہوتا
پاس ہوتے جو تم تو پل بھر میں
اک زمانہ گزر گیا ہوتا
تھی جو ہونا ہی دل کی رسوائی
پھول بن کر بکھر گیا ہوتا
کب چھلکتے ہیں اہلِ ظرف مجید
لاکھ پیمانہ بھر گیا ہوتا

★

جنونِ شوق، مری حسرتوں سے کم کیوں ہو
وفا کی راہ میں یہ لغزشِ قدم کیوں ہو
کسی کی چشم ہی بے آب ہے تو نم کیوں ہو
نہیں ہے لذّتِ احساسِ غم، تو غم کیوں ہو
کمالِ حسن ہیں رسوائیاں محبّت کی
رہینِ بُوالہوسیٔ عشق کا بھرم کیوں ہو
ستم رسیدۂ دوراں بہت ہیں دُنیا میں
مرے ہی حال پہ یہ بارشِ کرم کیوں ہو
ہزار خوگرِ عجز و نیاز ہوں لیکن
سرِ نیاز ہر اِک آستاں پہ خم کیوں ہو
بہ قدرِ ذوقِ طلب مے عطا ہو رندوں کو
یہ میکدہ ہے یہاں رسمِ بیش و کم کیوں ہو
ہر ایک چہرۂ گلرنگ پر کھلا ہوں مَیں جنید
تو پھر لہو سے مری داستاں رقم کیوں ہو

جوشِ وحشت میں ہیں گُم، رنگِ بہاراں کتنے
ہم نے صحرا میں سجائے ہیں گلستاں کتنے

شوقِ منزل نے یہ محسوس بھی ہونے نہ دیا
کتنے دُشوار مقام آئے ہیں، آساں کتنے

مَیں تو ہنستا ہی رہا ہاتھ میں ساغر لے کر
کیا خبر، سَر سے مرے ٹل گئے طوفاں کتنے

ایک ہلچل تو بپا ہو گئی دیوانوں سے
تُوڑنے سُونے تھے ترے شہر کے زنداں کتنے

ایک ہی خواب پہ قائم نہیں تعمیرِ حیات
لوگ دیکھیں گے ابھی خوابِ پریشاں کتنے

دِل کی حالت پہ کرم دیکھ کے بیگانوں کا
لوگ اپنوں سے بھی رہتے ہیں گریزاں کتنے

پاسِ آدابِ شبِ غم تھا محبّت میں مجید
ورنہ خورشید تھے پنہاں تہہِ داماں کتنے

یہ زلزلے، یہ حوادث، یہ آفتیں کب تک
کرینگی رقص زمیں پر قیامتیں کب تک

نیا ہے دور تو تخلیقِ نو کی بات کرو
جواں ہو ذہن تو کہنہ روایتیں کب تک

طلوعِ صبح تمنّا کی بات بھی تو کرو
شبِ فراق کی آخر حکایتیں کب تک

چمن چمن ہے مگر اے صبا! درونِ چمن
یہ تیری ریشہ دوانی کی عادتیں کب تک

بجا کہ جوشِ جنوں کی نہیں ہے حد کوئی
مگر یہ جہلِ خرد کی عنایتیں کب تک

کہیں تو سایۂ دیوار کی اماں بھی ملے
سہیں گے دھوپ کی آخر تمازتیں کب تک

مجید پھوٹے گی امّید کی کرن اک دن
شعاعِ مہر کو روکے گی ظلمتیں کب تک

وہ اجنبی سہی پھر بھی کام آیا ہے
ہمارے حال پہ جو مسکرا کے گزرا ہے
یہ کس کے خونِ تمنّا کا رنگ نکھرا ہے
روش روش جو گلستاں میں اک اجالا ہے
یہ اور بات کہ جل تھل ہے ریگزاروں میں
یہ کم نہیں ہے کہ بادل کہیں تو برسا ہے
جہاں بھی ذکر چھڑا ہے وفا شعاروں کا
مری نگاہ میں چہرہ کسی کا ابھرا ہے
عجب نہیں کہ ستارہ ہو اپنی قسمت کا
وہ ایک اشک جو پلکوں پہ آ کے ٹھہرا ہے
نہ پوچھ! کتنے زمانے تھے اُسکے دامن میں
وہ ایک لمحہ جو تیرے بغیر گزرا ہے
نکل بھی جاؤ! شبِ غم کی دسترس سے مجیدؔ
ستارے ڈوب رہے ہیں، ابھی سویرا ہے

اے جنونِ شوق پرور دیکھنا
دیکھکر صحرا، مرا گھر دیکھنا

خود نِگاہی کی یہی معراج ہے
سب کو برتر خود کو کمتر دیکھنا

اے اسیرو! جرم ہے یہ بات بھی
روزنِ زنداں سے باہر دیکھنا

ایک شیشے کے مکاں کیواسطے
کتنے ہاتھوں میں ہیں پتّھر دیکھنا

وسعتِ ظرفِ نظر کی بات ہے
خار کو گل کے برابر دیکھنا

دیکھنا ہے دھوپ کا منظر اگر
سایۂ گیسو سے ہٹ کر دیکھنا

توڑ لیتے ہیں کلی کو شاخ سے
لوگ کیسے ہیں ستمگر دیکھنا

لوگ دُہرائیں گے شعروں کو مرے
ذکر ہو گا تیرا گھر گھر دیکھنا
ہو مُبارک اَہلِ ساحل کو مگر
ڈوبنے والوں کا منظر دیکھنا

لاکھ دامانِ شفق گلرنگ ہے
تیرے عارض کا کہاں پاسنگ ہے

عارض و گیسو کی چشمک ہے وہی
نور و ظلمت میں ابھی تک جنگ ہے

خود سمٹ کر رہ گیا ہوں ذات میں
کہہ رہا ہوں یہ کہ دنیا تنگ ہے

اسکی کیا پہچان بتلائے کوئی
وہ تو خوشبو ہے نہ کوئی رنگ ہے

کون ورنہ پوچھتا ، الماس کو
جوہرِ ذاتی سے قدرِ سنگ ہے

قتل گہہ میں آ گئی شاید بہار
آج قاتل کی قبا گل رنگ ہے

سر اٹھا کر پھر بھی چلتا ہوں مجید
جانتا ہوں سنگ آخر سنگ ہے

عشق میں جاں سے گزرنا، عشق کا انعام ہے
یہ وہ رشتہ ہے کہ جسمیں ابتدا اِک اِک گام ہے

ہر در و دیوار ہے دل کے لہو سے لالہ رنگ
منظرِ شہرِ نگاراں کتنا خوں آشام ہے

خیر و شر کی چشمکِ پیہم ہے حُسنِ کائنات
یہ نہ ہو تو زندگی اوہام ہی اوہام ہے

کس طرف کو ہے اشارہ اور کدھر جاتی ہے بات
کام تو کرتے ہیں انساں، اہرمن بدنام ہے

مَیں نمایاں ہو رہا ہوں آپ اپنی ذات سے
اعتبارِ آگہی شاید اسی کا نام ہے

بزمِ صہبا میں سُنی تھی مَیں نے اِک جھنکار سی
یہ شکستِ دل ہے ساقی یا شکستِ جام ہے

روکتا ہے پاسِ آدابِ اسیری اے مجید
ورنہ اِک جُنبش مری، وجہِ شکستِ دام ہے

حُسن، آزادِ راہ و رسم ہُوا
اِک تکلّف تھا وہ بھی ختم ہُوا

عشق آوارہ، حُسن ہی بیباک
اَب حجابوں کا دَور ختم ہُوا

پھول برسے ہیں اِسقدر مجھ پر
سَر سے پا تک میں زخم زخم ہُوا

برف تھا دِل مگر سُلگ اُٹھّا
موسِم اِتنا کبھی نہ گرم ہُوا

جو غزلخواں تھے سُرخرو اُٹھّے
کچھ نہ کہہ کر میں ننگِ بزم ہُوا

حرفِ آغاز تھا پیامِ صلیب
لوگ سمجھے فسانہ ختم ہُوا

زعمِ باطِل کی یورشوں سے مجیدؔ
اور پختہ ہمارا عزم ہُوا

اَور کچھ نکھرے ذرا حُسنِ صفات
نامکمّل ہے اَبھی تصویرِ ذات

تیرا غم تھا میرا معیارِ حیات
کیا مِرے نزدیک آتے حادثات

شیش محلوں میں بھی اک ہلچل سی ہے
شہر میں جانے ہوئی کیا وَاردات

وہ جو آئے تو سحَر بھی آگئی
کاش اِتنی مختصر ہوتی نہ رَات

ہاں! دُعائیں دیجئے سُقراط کو
زَہرِ غم بھی بن گیا آبِ حیات

بُولتی آنکھوں نے سب کچھ کہدیا
کب رہی پوشیدہ دِل میں دِلکی بات

اُس نظر کی ایک جُنبش سے مُجیدؔ
کروٹیں لیتی ہے پہروں کائنات

نالۂ شب کا اثر دیکھیں گے
شمع کو وقت سحر دیکھیں گے

آنکھ اُٹھا کر وہ جدھر دیکھیں گے
میرا ہی حسنِ نظر دیکھیں گے

ہمسفر دیکھتے رہ جائیں گے
جب مِرا عزمِ سفر دیکھیں گے

جب بھی گزریں گے ترے شہر سے ہم
سنگ دیکھیں گے نہ سر دیکھیں گے

شہر کا شہر اُمنڈ آیا ہے
آپ کس کس کا جگر دیکھیں گے

لوگ پھینکیں گے مسلسل پتھّر
جس شجر میں بھی ثمر دیکھیں گے

اپنا اندازۂ قامت ہوگا،
لوگ جب "زخمِ ہنر"[۱] دیکھیں گے

۱۔ مجموعۂ کلام حضرت شاعر لکھنوی۔

زندگی کی راہ میں جب تھک کے رہ جاتے ہیں لوگ
وقت کے سفاک طوفانوں میں بہہ جاتے ہیں لوگ

زخم دے جاتا ہے اک، اک حرف نشتر کی طرح
باتوں باتوں میں غضب کی بات کہہ جاتے ہیں لوگ

خود قدم لینے کو آتی ہے حیاتِ جاوداں
سر اٹھا کر یوں بھی سوئے قتل گہ جاتے ہیں لوگ

جاگ اٹھتی ہیں ہزاروں زیست کی رنگینیاں
سادگی سے ایک ایسی بات کہہ جاتے ہیں لوگ

دیر الٹنے کو نہیں لگتی سیاست کی بساط
بادشاہوں کو بھی اکثر دے کے شہ جاتے ہیں لوگ

ہر عمل، ردِّ عمل کا پیش خیمہ ہے مجید
دہر کے جور و ستم بھی ہنس کے سہہ جاتے ہیں لوگ

دُوستی کی خاطر ہی، دُشمنی کا سَودا کر
زِندگی کے تیور کو اِس طرح بھی دیکھا کر

کون ہم سفر ہوگا یہ کبھی نہ سوچا کر
راستے بدل لیکن منزلیں نہ بدلا کر

کون جانے کل کیا ہو، کل کو کس نے دیکھا ہے
آج کے تقاضوں کو مت سپردِ فردا کر

روز و شب ہیں بے معنی وقت کے تسلسل میں
راہ کے مناظر میں اِس قدر نہ اُلجھا کر

مشورہ دُعاؤں کا دوسرے بھی دیتے ہیں
تُو اگر مسیحا ہے دَرد کا مُداوا کر

صرف سانس لینے کا نام زِندگی ٹھہرے
آدمی کی عظمت کو اِس قدر نہ رُسوا کر

شہر شہر مقتل ہے تیرے سَر فروشوں کا
تجھ کو خوف آئے گا آئینہ نہ دیکھا کر

زندگی دشوار تھی، دشوار ہے
کتنی یکساں وقت کی رفتار ہے

آئینہ خود آئینہ بردار ہے
یہ ہمارا چہرۂ کردار ہے

زندگی آزار ہی آزار ہے
پھر بھی ہم کو زندگی سے پیار ہے

وقت کا رُخ موڑ سکتا ہے وہی
وقت سے جو برسرِ پیکار ہے

جانے کتنے جھیلے بیٹھا ہے عذاب
یہ شجر جو آج سایہ دار ہے

گلستاں میں کیا نشیمن کا شمار
جب کہ گل ہی شاخِ گل پر بار ہے

کب تلک پاسِ زباں بندی مجید
زندگی لب تشنۂ گفتار ہے

حرفِ آگہی

ہے تیرگی میں نور فشاں "حرفِ آگہی"
ہے اعتبارِ دیدوراں "حرفِ آگہی"
یہ عہد آفرین و زمانہ طراز ہے
ہے ترجمانِ عصرِ رواں "حرفِ آگہی"

خورشید انجم

احسن تقویم

مسلسل ایک خاموشی مسلسل ایک سنّاٹا
فضا کی وسعتوں میں ہر طرف اک ہُو کا عالم تھا
اُجالے تھے، نہ سائے تھے، تمنّا تھی نہ حسرت تھی
نہ حُسن و عشق کے چرچے، نہ خلوت تھی نہ جلوت تھی
فقط اک شمع، بزمِ لامکاں میں تھی کہیں روشن
کسی کی ضَو سے ہوتی تھی فرشتوں کی جبیں روشن
اچانک ایک لفظِ "کُن" سے ہنگامہ ہوا برپا
خموشی پیش خیمہ تھی کسی طوفاں کی آمد کا
فضا میں ہو گئیں سرگوشیاں پیدا فرشتوں کی
وجودِ آدمِ خاکی نے ہلچل سی بپا کر دی
عیاں ہونا تھا آخر ہو گیا جو راز پنہاں تھا
زمانہ بھر کے ہنگاموں کا باعث ایک انساں تھا

اسی کے واسطے رعنائیِ شام و سحر رقصاں
اسی کے واسطے تابانیِ شمس و قمر رقصاں
یہی قطرہ ہے خود جس پر سمندر ناز کرتا ہے
یہی ذرّہ ہے جس کی ضَو پہ خاور ناز کرتا ہے
یہ ہے وہ خاک جس میں نورِ فطرت جگمگاتا ہے
اس آئینے میں حُسنِ آئینہ گر جھلملاتا ہے
اسی کے نام سے اِبلیس کا دل آگ ہوتا ہے
فرشتوں کی زبانوں پر اسی کا راگ ہوتا ہے

یہی اِنساں ہے جس کو احسنِ تقویم کہتے ہیں
جسے کونین والے لائقِ تعظیم کہتے ہیں

آشوبِ سنہ ۱۹۷۱ء

توڑ دو اے ساتھیو! ساز و رباب و چنگ و دف
ہاتھ میں شمشیر لو! میداں میں نکلو سر بکف
لوٹ جاؤ لوٹ جاؤ! اپنے ماضی کی طرف
اک نئے انداز سے دہراؤ تاریخِ سلف
تا بہ کے سہتے رہو گے طنزِ پیہم غیر کے
تا بہ کے بنتے رہو گے ان کے تیروں کا ہدف
اے زمینِ پاک! تیرے دشمنوں کا ذکر کیا
دوست بھی ہم کو نظر آتے ہیں اب خنجر بکف
کس کے خوں کی آبیاری سے چمن پر ہے نکھار
کس کے صدقے میں ملا تجھ کو بہاروں کا شرف
ہے لہو سے محسنوں کے تر یہ کس کی آستیں؟
کِس کے خوں سے غسل کرتے ہیں یہ تیرے ناخلف

سُرخرو جس نے کیا تجھ کو جگر کے خون سے
نام اسی لعلِ یمن کا تو نے رکھا ہے خزف
جن کی خاطر چھوڑ کر آئے تھے ہم اپنا وطن
اہلِ کوفہ کی طرح وہ ہیں مقابل صف بہ صف
دیکھ! جاں داروں کی اپنے شعلہ سامانی بھی دیکھ!
دیکھ! فرزندوں کو اپنے صورتِ اسپِ الف
آؤ! لکھّیں خونِ دل سے اپنی تاریخوں کو ہم
کس کی قسمت میں حیاتِ جاودان کا یہ شرف
ہے بہر قیمت ہمیں احساسِ خود داری کا پاس
تشنگی دریا میں بھی منظور ہے مثلِ صدف
قتل گہہ میں مجھ کو غافل تو نہ پائے گا مجیدؔ
تو ہے گر خنجر بکف تو میں بھی ہوں اب سر بکف

ماضی کی تلخیوں کا عبث تذکرہ مجیدؔ
کب دیکھتا ہے کارواں مُڑ کر غبار کو

طلوعِ سحر

وہ ختمِ شب کا منظرِ خاموش اَلاماں
تیزی سے بھاگتا ہوا، تاروں کا کارواں
بُجھتے ہوئے چراغ، سِسکتا ہوا دُھواں
رقصاں کہیں کہیں پہ اُجالوں کی جھلکیاں
لیلیِ شب کی آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
ہنستی کلی سے صبح کے نغمے چھلک پڑے
ـــم ٹوٹ گیا ایک آن میں
کر
ـے زرد ہوئے آسمان میں
ـی ہوگئی پیدا جہان میں
جان ـــ جیسے ہر اک شئے کی جان میں
پَل بھر میں حُسنِ زیست کا سامان ہوگیا
تازہ سحر کے جلووں سے ایمان ہوگیا

ہر شاخِ گل پہ بلبلِ رنگیں ہے نغمہ زن
مارے خوشی کے چاک کیا گل نے پیرہن
صحنِ چمن میں نرگسِ شہلا ہے خندہ زن
سبزہ بھی اپنے حال میں ہے مست اور مگن

موجِ نسیم کی یہ ادا سب کو بھا گئی
آئی تو جیسے عید کا مژدہ سنا گئی

ناقوس کی صدا کہ مؤذن کی ہو اذاں
کعبہ کا ذکر ہو کہ کلیسا کی داستاں
زاہد کا زُہد ہو کہ وہ صوفی کا ہو بیاں
واعظ کا وعظ ہو کہ برہمن کی ہو زباں

ہر اک کو اپنی اپنی عبادت سے کام ہے
ہر لب پہ وقتِ صبح، فقط حمد نام ہے

دیکھو تو اپنے دیدۂ بینا سے اک نظر
نورِ سحر میں جلوۂ یزداں ہے جلوہ گر
شبنم کا ہو گہر کہ ہو نرگس کی چشم تر
پاتے ہیں نور ایک ہی مرکز سے بام و در

قربان اے خدا تری حکمت پہ جان و دل
سو جان سے فدا تری حکمت پہ جان و دل

خاموشیوں میں صبح کی اک شور مچ گیا
بزمِ سکوتِ شب میں ہوا حشر سا بپا
کلیاں چٹک چٹک گئیں، سبزہ بھی جھوم اُٹھا
بے جاں میں جان ڈال گئی تیری اک ادا
عیسیٰ نفس کہیں کہ مسیحا کہیں تجھے
موجِ نسیم! تو ہی بتا، کیا کہیں تجھے

کیف و سرور بخش دیا مثلِ جامِ نو
چمن میں آئی ہے تو اک پیامِ نو
سحر میں چھیڑ کے ذکرِ نظامِ نو
آ اے نسیم صبح! کریں اہتمامِ نو
ہر ذرّہ کائنات کا تیرے اثر میں ہے
سامانِ صد بہار، تری اک نظر میں ہے

Scanned by CamScanner

تیرے بغیر صحنِ گلستاں فضول ہے
تیرے بغیر چُپ ہے چمن کا جو پھول ہے
اَے نازشِ سحر! یہ ہمارا اصول ہے
گلشن میں تو نہیں ہے تو صحرا قبول ہے

تیرے ہی دَم سے غیرتِ جنّت ہے یہ چمن
گر تو نہیں تو باعثِ وحشت ہے یہ چمن

تجھ پر چمن کو ناز ہے اَے جانِ نوبہار
کرتے ہیں روز اَہلِ نظر، تیرا انتظار
اَے جانِ انتظار، ہے تو وجہِ افتخار
تجھ بن نہیں ہے اَہلِ چمن کو ذرا قرار

دیکھا تجھے چمن میں تو غنچے مہک اُٹھے
چہرے گلوں کے فرطِ طرب سے دمک اُٹھے

تو حُسن کی بہار ہے، جانِ شباب ہے
گلشن میں تیرے دم سے نئی آب و تاب ہے
تو ماہتاب اور تو ہی آفتاب ہے
تو رُوئے کائنات کا رنگیں نقاب ہے

ہر رنگ، ہر لباس میں کتنی حسین ہے تو
سچ سچ بتا نسیم! کہاں کی مکیں ہے تو

دُنیا

مسلسل زیرِ استبداد ہے دُنیا
غلامی سے کہاں آزاد ہے دُنیا

کہیں ویراں، کہیں آباد ہے دُنیا
عجب مجموعۂ اضداد ہے دُنیا

یہ اک معمورۂ آہ فغاں بھی ہے
بظاہر جنّتِ شدّاد ہے دُنیا

بچشمِ غیرتِ احساس تو دیکھو
نشانِ عبرت اجداد ہے دُنیا

ابھی تک جذبۂ توحید ناقص ہے
ابھی تک مسکنِ الحاد ہے دُنیا

ابھی تصویرِ دُنیا نامکمّل ہے
ابھی منّت کشِ بہزاد ہے دُنیا
مجیدؔ اپنے لئے کیا فرق پڑتا ہے
اگر فردوس کی ہمزاد ہے دُنیا

اِحاطۂ علم و فن کی وسعتوں کا غیر ممکن ہے
یہ وہ دریا ہے جو اپنا کوئی ساحل نہیں رکھتا

عکسِ خط

پروفیسر مجتبیٰ حسین ۔ صدر شعبۂ اردو، بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ

مکرمی ۔ تسلیم

زخمِ بہاراں ملا ۔ بہاروں سے زخم کا سودا اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے ۔ نام بہت اچھا رکھا ہے ۔ مجموعۂ کلام کا ظاہری جسم جسے گیٹ اپ کہتے ہیں صاف ستھرا اور دلکش ہے ۔ بڑی بات یہ ہے کہ عہدِ حاضر کی زخمی آوازیں ان کے کلام میں سنائی دیتی ہیں ۔

میں شکر و سپاس ہوں کہ آپ نے مجھے ان کے مجموعۂ کلام سے نوازا ۔

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے

خیر اندیش

مجتبیٰ

کوئٹہ

۲۷/۱/۷۸

خط بنام خورشید افسر

پروفیسر منظر ایوبی

"اس موقع پر مجھے کسی ادیب کے وہ الفاظ یاد آ رہے ہیں جو اس نے مولانا ظفر علی خاں کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ادا کیے تھے۔ ان کا مفہوم کچھ اس طرح کا تھا کہ "ظفر علی خاں بڑے ذہین، متین، زود گو اور لا محدود ادبی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ لیکن افسوس کہ ان کی سیاست نے اُن میں شاعری کی دنیا میں وہ عظیم مرتبہ حاصل نہ ہونے دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں شعر گوئی میں صرف کرتے تو اقبال سے بڑے شاعر ہوتے۔

مجید کھام گانوی کے بارے میں بھی اگر میں مذکورہ اقوال کا سہارا لیتے ہوئے یہ بات کہوں تو شاید بیجا نہ ہوگا کہ اگر مجید کھام گانوی اپنی بیشتر شعری و فنی توانائیاں سیاست کی نذر نہ کرتے تو آج بڑے بڑے قدآور شعراء ان کے سامنے بونے نظر آتے۔"

سیّد قوی احمد

پرنسپل گورنمنٹ سندھ کالج آف کامرس حیدرآباد (سندھ)

" عبدالمجید صاحب اُردو کے شاعر اور تحریک پاکستان کے ایک سپاہی بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں حقیقت نگاری، ان کے اسلوبِ سخن میں اخلاق اور اخلاص کی جھلک عیاں ہے۔ وہ شعوری طور پہ انسان دوست اور ایثار و محبت کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ ان کے کلام میں حالات کی عکاسی اور جذبات کی سچائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کا انداز مثبت اور رجائی ہے اور قنوطیت سے مبرّا ہے۔ وہ ایک مردِ مسلمان کی طرح نامساعد حالات سے نبرد آزما رہنا چاہتے ہیں۔"

پروفیسر اظہر قادری

"زخم بہاراں" مجید کھام گانوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے اور اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ شاعر باشعور اور سلیقہ مند ہو تو غزل آج بھی کام کی چیز ہے۔ وہ لوگ جو اپنی کوتاہی کی وجہ سے وزن، ردیف، قافیے اور زبان و بیان کے مستند اصولوں کو فرسودہ قرار دے کر اپنی بے لگام اور بے ربط تخلیقات کو شاعری کا نام دیتے اور شعری پابندیوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے غزل کو ماضی کی یادگار کہہ کر اپنی مجبوریوں پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، ان کے لئے "زخم بہاراں" ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ زخم بہاراں کے ایک سرسری مطالعے سے بھی اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جب غزل ایک اچھے شاعر کے ہاتھ لگ جاتی ہے تو وہ اپنے اندر چھپے ہوئے امکانات بروئے کار لاکر اپنی توانائی اور نامیاتی قوتوں کا ثبوت فراہم کرنے لگتی ہے۔

شارب ایرانی

مدیر اعلیٰ، ماہنامہ زبانِ ہند (کانپور)

"مجید صاحب کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان کی شاعری صرف سیاست کی پابند نہیں وہ انسان کے حالات و کردار و عمل پر بھی نظر رکھتے ہیں۔"

Prof. Karar Husain
(Former Vice-Chancellor, Baluchistan University)

"The different moods of human experience and striking novelties are the basic features of Majeed Khamgoanvi's poetry. He has opened up new vistas in the domain of urdu ghazals and his ghazals are true in nature, pure and perfect" – Dawn, Karachi.